۹

قائداعظم لائبریری کا شش ماہی ادبی مجلّہ

دورِ جدید

# مخزن لاہور

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور

# مخزن

شمارہ مسلسل ۹

۲۰۰۵ء

جلد ۵ شمارہ ۱

## مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

انتظار حسین

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر طاہر تونسوی

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)

ہارون عثمانی (منتظم)

## جملہ حقوق محفوظ

ناشر: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

فون نمبر: ۹۲۰۱۰۰۷۔ فیکس: ۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qal@brain.net.pk

ویب سائٹ: www.qal.edu.pk

کمپوزر: محمد اکرام الحق

طابع: ارفع پرنٹنگ سروسز، عزیز منشن، گلی نمبر 4، رائل پارک لاہور

صفحات: ۱۵۲

قیمت: ۱۰۰/- روپے

### ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو دو نسخے روانہ کیے جائیں۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور سے کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔

# ترتیب


| | | |
|---|---|---|
| اداریہ: | | ۵ |
| مشفق خواجہ کی یاد میں: | | |
| ۱۔ مشفق خواجہ۔ نگینہ شخص رخصت ہوا | ڈاکٹر ممتاز احمد خاں | ۷ |
| ۲۔ مشفق خواجہ | ڈاکٹر سلیم اختر | ۱۰ |
| ۳۔ انتخاب خامہ بگوش | مشفق خواجہ | ۱۶ |
| i۔ ادبی خرکار | | |
| ii۔ ردیات ادب | | |
| iii۔ شاعری پر شب خون | | |
| ۴۔ مشفق خواجہ کے چند خطوط | حواشی و تعلیقات: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی | ۲۸ |
| ۵۔ مکتوبات (عکسی) | مشفق خواجہ | ۴۲ |
| ادبیات: | | |
| ۱۔ تنقید کا ساختیاتی رخ | تحسین زہرا | ۴۸ |
| ۲۔ مکاشفے کی نفسیات۔ ہیلڈا ڈولٹل | ڈاکٹر شاہین مفتی | ۵۵ |
| ۳۔ اردو کا شاہکار افسانہ۔ قید خانہ | ڈاکٹر محمد کامران | ۶۰ |
| ۴۔ غالب کے تین فارسی مکاتیب۔ اردو ترجمہ | پرتو روھیلہ | ۶۶ |
| ۵۔ بال جبریل، غزل ۳: ایک تشریح | ڈاکٹر صدیق جاوید | ۷۰ |
| ۶۔ سر عبدالقادر اور اردو ہندی نزاع | محمد حنیف شاہد | ۷۶ |
| تجزیے اور جائزے: | | |
| ۱۔ یادوں کے دیے (حمزہ فاروقی) | ڈاکٹر انور سدید | ۸۰ |
| ۲۔ نفائس ادب | ریاض احمد | ۸۴ |
| ۳۔ اردو کی دو آپ بیتیاں | ڈاکٹر انور محمود خالد | ۸۸ |
| ۴۔ ٹی اینڈ ٹی پبلشرز کی چار کتابیں | فرح ہارون | ۹۵ |

فنون لطیفہ:


| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ مصورانہ خطاطی۔ بیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک | اسلم کمال | ۹۹ |
| ۲۔ بشیر موجد کی مصورانہ خطاطی کا پس منظر | ڈاکٹر آغا سہیل | ۱۰۷ |
| ۳۔ مرقع چغتائی۔ غالب کے مصور نسخے کی داستانِ تخلیق | محمد عبدالرحمٰن چغتائی | ۱۱۳ |


انتخاب:


| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ بیگم آل احمد سرور سے خصوصی ملاقات | آزرمیدخت صفوی | ۱۲۰ |
| ۲۔ مولانا ظفر علی خاں | مولانا حامد علی خاں | ۱۳۰ |


مخزن:


| | | |
|---|---|---|
| آرا اور تبصرے | | ۱۳۴ |


قائداعظم لائبریری:


| | | |
|---|---|---|
| قائداعظم لائبریری کی علمی و ادبی سرگرمیاں | ہارون عثمانی | ۱۴۵ |
| لائبریری میں آنے والی نئی کتب | فہیم عثمانی | ۱۴۷ |
| نویں شمارے کے قلمی معاونین | | ۱۵۲ |

# اداریہ

مخزن کی صد سالہ زندگی میں یہ پہلا دور ہے کہ پرچہ نستعلیق کمپیوٹر پر شائع ہو رہا ہے۔ اردو کتابت اب تک کئی منزلیں طے کر چکی ہے۔ پہلا دور وہ تھا جب چھاپہ خانے میں پتھر کی سلیں استعمال ہوتی تھیں۔ زردلئی کی سطح پر کتابت ہوتی، عبارت کو پتھروں پر الٹا جمایا جاتا، غلطیوں کی تصحیح سنگ ساز خط معکوس میں کرتے تھے۔ پھر پتھر کی بجائے دھاتی پلیٹوں کا رواج ہوا۔ بیسویں صدی میں آفسٹ اور ونڈانک کا چلن ہوا۔ پھر سکے کو ڈھال کر چھپائی کا دستور ہوا اور نستعلیق کی جگہ نسخ نے لی۔ باریک بٹر پیپر پر کتابت ہونے لگی۔ پریس پر پروف نکالے جاتے اور ان کی تصحیح ہوتی۔ پھر نستعلیق دوبارہ بحال ہوا اور کمپیوٹر نے اسے حیات نو عطا کی۔ پروف خوانی کا مسئلہ پھر بھی ہمارے ہاں ٹیڑھا رہا۔ مغرب میں یہ باقاعدہ ایک علم ہے اور اس فن کے ماہر پروف خوانی کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کاتب، مصنف اور کمپیوٹر کار اس کی زد میں آئے۔ مصنفین کو شکایت رہی کہ کمپیوٹر کار ناخواندہ ہیں، غلطیاں لگانے میں عبارتوں کو کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں۔ کاتب گئے تو کمپیوٹر ایجاد ہوا۔ اب کمپیوٹر کاروں کی نئی نسل سامنے آئی۔ کاتب حضرات نے یہ پیشہ اختیار نہیں کیا۔ ایک دوسری نسبتاً زیادہ ناخواندہ نسل اس پیشے پر حاوی ہوگئی۔

۱۹۰۱ء میں مخزن نے اپنے سفر کا آغاز پتھر کی سلوں سے کیا تھا۔ پھر دھات کی پلیٹیں آ گئیں۔ پھر آفسٹ کا دور آیا۔ اب کمپیوٹر کا دور دورہ ہے۔ اب مخزن کو ٹائپ کار کمپیوٹر پر ٹائپ کرتا ہے۔ غلطیاں اب پہلے مرحلے میں لگائی جاتی ہیں۔ کاغذ پر پروف نکلتے ہیں، عبارتیں مصنف یا مدیر یا عملہ درست کرتا ہے۔ کمپیوٹر والا غلطیاں لگاتا ہے۔ کچھ غلطیاں لگتی ہیں کچھ رہ جاتی ہیں۔ مخزن کے ہر شمارے میں آپ کو غلطیاں ملیں گی۔ بعض معمولی، بعض مضحکہ خیز۔ مثلاً ایک گزشتہ شمارے میں غیض و غضب لکھا ملے گا۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ لفظ 'ظ' کے ساتھ ہے 'ض' کے ساتھ نہیں۔ یعنی غیظ (غ ی ظ) ہے۔ سبب یہ ہے کہ:

ا) کمپیوٹر کار کا ذخیرہ الفاظ محدود ہے۔

ب) پروف خواں ماہر نہیں۔

ج) مصنف اس علم سے ناواقف ہے۔

مغرب میں پروف خوانی مستقل علم ہے۔ اس کے ماہر غلطیاں لگاتے ہیں اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ قائداعظم لائبریری نے بعض علوم کی شاخوں پر ورکشاپوں کا آغاز کیا ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ پروف خوانی پر بھی لائبریری ایک ورکشاپ کا اہتمام کرے۔ پھر ایک مختصر مدت کی ٹریننگ کلاس کا اجرا ہو تا کہ ملک میں ماہر پروف خواں دستیاب ہو جائیں اور کتابیں، رسائل غلطیوں سے پاک ہو کر چھپیں۔

**مدیر**

# مشفق خواجہ۔ نگینہ شخص رخصت ہوا

ڈاکٹر ممتاز احمد خان

میں اس مضمون کا آغاز یہ کہہ کر کروں گا کہ مشفق خواجہ زندہ رہنے کے لیے پیدا ہوئے تھے! ادب کے بڑے آدمی ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

مشفق خواجہ جیسی نادر روزگار شخصیت کراچی میں ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء علم وادب سے متعلق لاتعداد حضرات کو سوگوار کر کے رخصت ہوگئی۔ بہت کم ایسے ادیب، نقاد، محقق اور شاعر ہوتے ہیں جن کی رخصتی کا غم صحیح معنوں میں محسوس کیا جاتا ہے۔

مشفق خواجہ علمی وادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے بہت سے طالب علم باوجود اس کے کہ علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں خود نہ ادیب ہوتے ہیں اور نہ شاعر۔ یہ کسی بھی گھرانے کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اس کے یہاں دو نسلوں میں قابل ذکر عالم اور ادیب پیدا ہوں اور ان میدانوں میں اپنا نقش ثبت کریں۔

مشفق خواجہ نے اپنا سفر انجمن ترقی اردو سے شروع کیا جہاں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انہیں مخطوطات کے شعبے کی ذمہ داری عطا کی جس کے نتیجے میں بہت سے مخطوطات اور تحقیقی مقالات نے کتابی صورت اختیار کی اور تشنگان علم، ادب و تحقیق کو سیراب کیا۔ مشفق خواجہ اچھے شاعر تھے۔ ''ادبیات'' ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چوں کہ وہ انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے اور قدرت نے انہیں زرخیز علمی وادبی ذہن سے نوازا تھا اسی لیے انہوں نے اپنی کالم نگاری سے پوری ادبی دنیا کو متاثر کیا۔ لیکن یہ کالم نگاری ادق موضوعات سے متعلق نہیں تھی بلکہ طنز ومزاح اور فکاہیہ تحریروں پر مبنی تھی۔ وہ ادیبوں کو ان کی تحریروں اور انٹرویو اور ارشادات کے حوالے سے مزاح اور طنز کا نشانہ اس طرح بناتے تھے کہ مضروب کو بھی ضرب سے لطف کا مزا حاصل ہوتا تھا۔ ان کا اسلوب مزاح اور طنز ایک علیحدہ ہی طرز رکھتا تھا۔ جس زمانے میں وہ کراچی کے ایک اخبار میں یہ ہفتہ وار کالم تحریر کرتے تھے اس زمانے میں ہر شخص جمعہ کے دن ''خانہ بگوش کے قلم سے'' والا کالم پڑھنے کے لیے بے چین ہوتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اب کس کی باری ہے؟ مشفق خواجہ جملے میں سے مزاحیہ جملہ تراشنے کا فن جانتے ہیں جن میں سے دو متضاد مزاحیہ وطنزیہ صورت ہائے احوال کے امتزاج سے ایک ایسا منظر نامہ وجود میں آتا تھا جس سے کوئی بھی قاری محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ پاتا تھا۔ ان کے کالم کی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ معاندانہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ خانہ بگوش کے قلم سے ''سخن در سخن'' اور ''سخن ہائے ناگفتنی'' ناقابل فراموش ادبی سرمایہ ہے۔

تحقیق میں بھی انہوں نے اپنے لیے حسب معمول ایک نئی راہ نکالی تھی یعنی تحقیق کے ذریعہ حقیقت کے دروازے کا کھولا جانا تا کہ دوسرے اس سے مستفید ہوں اور اس خاص موضوع پر تحقیق کے دوسرے چراغ بھی روشن ہوں۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ صرف اسی شخص کو تحقیق کا موضوع بنائیں جس کا سوفی صد حق ہو "غالب اور صفیر بلگرامی" "خوش معرکہ زیبا (تذکرہ شعرا مصنفہ سعادت خان ناصر)" "پرانے شاعر نیا کلام" اقبال از احمد دین (اقبال پر پہلی کتاب جوان کی زندگی میں شائع ہوئی تھی پھر جلادی گئی۔ اس پر خواجہ صاحب کا مقدمہ بھی ہے) "جائزہ مخطوطات اردو"، "تحقیق نامہ" وہ انجمن ترقی اردو کے رسائل "قومی زبان" اور "قاموس الکتب" کے علاوہ "سہ ماہی اردو" سے متعلق بھی رہے۔ وہ "سہ ماہی غالب" کے بھی مدیر تھے۔ لیکن ایک بھاری کام "کلیات یگانہ" ہے جس پر آنے والے دنوں میں صحیح معنوں میں جو تبصرے، تجزیے اور مضامین آئیں گے وہ ان کی عظیم ادبی حیثیت اور مرتبے کا صحیح تعین کریں گے گو کہ اب بھی بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسی اردو زبان و ادب کی دیومالائی شخصیت کے زیر تربیت ہونے پر کسی بنا پر وہ خود بھی دیومالائی حیثیت اختیار کر چکے ہیں بلکہ میں تو بڑی ذمہ داری سے انہیں اپنے میدان کا مستند لیجنڈ Legend قرار دوں گا۔

وہ عظیم المرتبت حیثیت کے مالک اس لیے بھی بنے کہ شہرت اور نام و نمود سے دور رہے۔ بہت سے لوگ شہرت سے دور رہتے ہیں اور بہت قابل ذکر کام کر جاتے ہیں۔ مگر ان کی بھی محدودیت ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کی خوبی یہ تھی کہ دنیا سے لگ تھلگ رہنے کے باوجود وہ پوری ادبی دنیا کے ہر ہر شہر اور قصبے میں جاری و ساری ادبی و علمی سرگرمیوں سے واقف تھے۔ ہر کام کی تحریر پڑھتے تھے۔ کتابیں خریدتے تھے انہیں اپنی لائبریری کی سائنسی انداز سے زینت بناتے تھے یعنی ادھر آپ نے کسی کتاب کا نام لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اسی کتاب کے شیلف پر پہنچ گئے۔ انڈیا پاکستان اور دوسرے ممالک سے آنے والے استفسارات کا وہ شافی جواب اسی وجہ سے دے پاتے تھے جس سے لوگ ان کے ممنون احسان رہتے تھے۔ افسوس کہ اب وہ دروازہ بند ہو گیا ہے یہ ضرور ہے کہ مشفق خواجہ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی عہد میں ایک دوسرا عظیم شخص پیدا کر دیتا ہے۔ لیجنڈز اور کلاسیکل اہمیت کے حامل اشخاص صدیوں کے سفر میں اسی طرح ایک کے بعد ایک آتے رہتے ہیں۔

مشفق خواجہ عظیم انسانی خصوصیات کے حامل آدمی تھے وہ لوگوں سے ملتے تو خوشگوار تاثر چھوڑتے اور کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کرتے کہ ملاقاتی اسے یاد رکھنے پر مجبور ہوتا۔ وہ تعریف کرنے میں کشادہ دل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک دوست جو فکشن کے انداز میں ایک ڈائجسٹ میں معروف و قابل ذکر شخصیات پر مضامین تحریر کر رہے تھے ان سے پہلی ملاقات میں اس کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ ان کے پاس پوری سیریز موجود ہے۔ اسی طرح وہ جس ادیب و شاعر اور نقاد میں تخلیقی چنگاری دیکھتے اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ وہ لوگوں کی ضروریات کا بڑا خیال رکھتے تھے اس سے قبل کہ کوئی مدد کا طالب ہو خود ہی خاموشی سے نواز دیا کرتے تھے۔ وہ بے روزگار ادیبوں کے لیے روزگار کا بندوبست بھی خاموشی سے کرتے۔ ایسا لگتا تھا گویا ادب کی دنیا میں موجود افتادان خاک کو اوپر اٹھانے کا

انہوں نے ذمہ لیا ہوا تھا۔ وہ بدلہ لینے کے قائل نہ تھے خاصے لوگ ان کے قریب آئے مگر تھوڑے دنوں بعد ان دوستوں کی کم ظرفی نے رنگ دکھایا اور پھر خواجہ صاحب سے دور ہو گئے اور خواجہ صاحب نے بھی انہیں بھلا دیا اس لیے انہیں ''کام بہت مگر زندگی مختصر'' والے مقولے کے تحت اس قسم کے جھگڑے پالنے کا شوق نہ تھا۔ ان سے جو بھی اپنی ذاتی کمزوری کے تحت دور ہوا اس نے اپنا ہی نقصان کیا۔

خواجہ صاحب ہر ہفتے اپنی علمی و ادبی محفل سجاتے تھے جس میں اہم لوگ شریک ہوتے تھے۔ وہ مہمان نواز شخص تھے۔ بھارت اور دوسرے ممالک سے آنے والے ادیبوں شاعروں اور نقادوں کی دعوت کرنا ان پر فرض تھا۔ انہوں نے ''تخلیقی ادب'' کا اجرا کیا تو اس کی دھوم مچ گئی حالاں کہ ''نقوش''، ''سیپ'' اور ''فنون'' کی موجودگی میں ایک نئے رسالے کا نقش جمانا امر محال تھا مگر وہ جذبے سے بھرپور اولوالعزم شخص تھے۔ انہوں نے جس سے ادبی تحریر کے لیے رابطہ کیا اس نے اسے اپنے لیے اعزاز گردانا۔ انہوں نے بغیر طلب کیے تحریروں کا معاوضہ پیش کیا۔ انہوں نے میرے انگریزی ادب کے استاد اور معروف ناول نگار و نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی کی دونوں کتابوں ''ادبی تخلیق اور ناول'' اور ''فریب نظر'' کی بھرپور رائلٹی ادا کی جبکہ بڑے بڑے پبلشروں میں چند پبلشر کتابوں کا معاوضہ دینے میں پس وپیش کرتے ہیں اور کتابوں کی فروخت سے لاکھوں روپے کماتے ہیں مگر یہ ایک دوسرا قصہ ہے۔

ان کی بذلہ سنجی پر ایک سے زیادہ کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ ایک مضمون میں ان کی شخصیت کا احاطہ نہیں ہو سکتا ایک ہی شخص ان پر کئی مضامین تخلیق کر سکتا ہے۔ وہ نگینہ شخصیت تھے جس پر پاکستان بھارت اور دوسرے ممالک میں موجود اردو زبان و ادب سے متعلق حلقے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مسافر ایسے گئے ہیں کہ لوٹتے ہی نہیں
کھلے ہوئے ہیں ابھی تک گھروں کے دروازے

## مقالہ نگاروں سے التماس

طبع شدہ یا کسی اور رسالے کو ارسال کردہ مقالے مخزن میں اشاعت کے لیے نہ بھجوائیں اور نہ ہی مخزن کو بھجوائے گئے مقالے اشاعت کا فیصلہ ہونے تک کسی اور رسالے کو ارسال کریں۔

**مدیر**

# مشفق خواجہ

ڈاکٹر سلیم اختر

دوست، رشتہ دار، عزیز، رفیق کار۔ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں، ملتے جلتے ہیں مگر ہم بطور خاص نہ تو ان کی ذات وصفات پر توجہ دیتے ہیں اور نہ ان کے بارے میں شعوری طور پر ہی سوچتے ہیں۔ قرب گویا ایک پردہ سا حائل کر دیتا ہے یوں کہ نظر آتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے لیکن ان کے رخصت ہوتے، جیسے ہی قربت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اچانک ہی انہیں دیکھنے کا تناظر بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

۲۲ فروری ۲۰۰۵ء کا اخبار میرے سامنے کھلا تھا جسے میں گویا دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ رہا تھا۔ چند سطروں کی مختصر خبر مشفق خواجہ کی موت کی اطلاع دے رہی تھی، میں جیسے بے حواس ہو گیا۔ سارا دن عجیب بے کلی میں گزارا۔ کالج میں دوستوں سے تذکرہ کرتا رہا، ان کی باتیں کر کے خود کو بہلاتا رہا، ان کے لطیفے سنا سنا کر گویا خود ہنسنے کے بہانے تلاش کرتا رہا۔ سوچا آمنہ بھابی سے فون پر تعزیت کروں مگر زبان تعزیتی الفاظ کی ادائیگی سے قاصر رہی، صبر کرو، اللہ کی مرضی، وقت آ گیا تھا۔ انسان موت کے سامنے بے بس ہے، عظیم نقصان مگر کتنے سنے الفاظ، کھوکھلے، بے معنی!

مشفق خواجہ ..... زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

مشفق خواجہ کی شخصیت متنوع جہات کی حامل تھی۔ تحقیق وتنقید تو صرف شخصیت کا نسبتاً نمایاں پہلو تھا اور دنیا والوں نے انہیں اسی حوالے سے جانا اور مانا تھا۔ لیکن وہ محض خشک مقالات قلم بند کرنے والے محقق ہی نہ تھے، شاعر کا قلب حساس بھی رکھتے تھے۔ مجموعہ کلام ''ابیات'' کے نام سے چھپ چکا ہے مگر انہوں نے شاعری کو کبھی بھی ذریعۂ عزت نہ جانا۔

جب انہوں نے پہلے روزنامہ ''جسارت'' کراچی اور پھر ہفت روزہ ''تکبیر'' (کراچی) میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے ادبی شخصیات پر کالم نگاری کا آغاز کیا تو یہ اچنبھے کا تماشا ثابت ہوا تو بطور طنز نگار ان کے جوہر کھلے۔ ایسے ایسے کاٹ دار فقرے، طرح دار جملے اور پہلو دار کنایے کہ خامہ کی مانند عالم انگشت بہ دنداں والا عالم ہو گیا۔ جس پر کالم لکھا اس کے علاوہ ہر شخص دوسروں کو کالم کے خاص خاص جملے سناتا۔ دراصل ادبی کوتاہیوں، جھوٹ، منافقت اور نالائقیوں کے خلاف یہ کالم ایک نوع کی صدائے احتجاج تھے۔ انہوں نے جب سچ بولنے کا بیڑا اٹھا لیا تو پھر ہر چہ باداباد۔ قلم کی کشتی مخالفتوں کے ساگر میں ڈال دی، اس ضمن میں انہوں نے دوستوں کی بھی پروا نہ کی۔ کالم کی خاطر کئی ''عزیز'' دوست گنوا دیے مگر انہوں نے خسارے کا یہ سودا خندہ پیشانی سے

قبول کیا۔ تاہم یہ نہ سمجھیے کہ کالم صرف فقرے بازی تک محدود ہوتے تھے۔ ایسا 'انہیں' ان کی تحقیقی معلومات، ادبی شخصیات کے بارے میں ٹھوس اطلاعات اور حقائق فراہم کرتی تھیں۔ اسی طرح ان کی تنقیدی نگاہ کتاب اور صاحب کتاب کی پرکھ کے لیے میزان کا کام کرتی تھی، ایسی میزان جسے انہوں نے مضبوطی سے تھاما ہوتا، مظفر علی سید کے مرتبہ ان کے کالموں کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ''سخن ہائے ناگفتنی'' اور ''سخن در سخن''۔

ان کالموں کے سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ایک کردار استاد لاغر مراد آبادی کے نام سے تخلیق کیا، ایسا کردار جو دراصل ان ہی کا ہمزاد تھا مگر انہوں نے نکتہ افروزی کے لیے اسے گویا زبان خلق کا نقارۂ خدا بنا دیا۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

☆ ''آج کل کتاب لکھنا اتنا آسان ہو گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں کتاب کی جلد سازی ایک مشکل کام نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جلد سازی کے پیشے میں ناکام ہونے والے بھی کامیاب مصنف بن جاتے ہیں۔ مشکل کام اگر کوئی ہے تو وہ کتاب کا پڑھنا ہے، اس مشکل کام کو آسان بنانے کے لیے ہم نے ایک عرصے سے مطالعۂ کتب کا شغل ترک کر رکھا ہے''۔ (سخن ہائے ناگفتنی)

☆ ''اردو کے عام اخبارات تو اپنے اداریوں اور ادارتی صفحات کی وجہ سے مزاحیہ اخبار سمجھے جاتے ہیں لیکن لندن کے روزنامہ ''جنگ'' کو اپنے ادبی صفحہ کی بنا پر ''اودھ پنچ'' کے مقابلے پر رکھا جا سکتا ہے''۔ (لوح جہاں پہ حرف مکرر)

☆ ''جس طرح نمک کے بغیر کھانا بے مزہ ہوتا ہے اسی طرح اگر بھائی فاروقی کے کسی انٹرویو میں احمد فراز کا ذکر نہ ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ انٹرویو نہیں پڑھ رہے کشور ناہید کی کوئی نثری نظم پڑھ رہے ہیں''۔ (ایضاً)

☆ ''اپنے متعلق جون ایلیا نے کہا ہے کہ میں ایک ناکام نقاد ہوں۔ گزارش ہے کہ اس قسم کے معاملات میں احتیاط سے کام لینا چاہیے، جہاں اہل نظر آپ کی دس باتوں سے اختلاف کرتے ہیں، ایک آدھ بات سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں''۔ (شاعری یا معجون شباب آور)

☆ ''بعض کتابیں اگر شائع نہ ہوں تو اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں لیکن بعض ایسی کتابیں بھی ہوتی ہیں جو شائع ہو کر ضائع ہو جاتی ہیں''۔ (آپ بیتی یا آپ بیتی کی معذرت)

☆ ''یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اردو ادب کی عزت افزائی کا سبب غزل گو شعراء ہیں یا وہ مقالہ نگار جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے تحقیق کرتے ہیں۔ غزلوں کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ پی ایچ ڈی کے مقالے ہیں۔ یہ راز نہیں کھلتا کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کیوں کہا جا رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کے مقالے دیکھیے تو گمان گزرتا ہے جیسے غزلیں کہی جا رہی ہیں''۔ (بڑا شاعر چھوٹا آدمی)

☆ ''ایک زمانہ تھا کہ مشاعروں میں ایسے شعر پڑھے جاتے تھے جنہیں سن کر چھتیں اڑ جاتی تھیں مگر اب یہ حال ہے کہ

مشاعرہ سنتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بس زمین شق نہ ہو جائے''۔(ادبی خانہ خرابیاں)

☆ ''.....اردو کا ہر پانچواں شاعر مزے دار شاعر ہے باقی چار شاعر اس لیے مزے دار نہیں بن سکے کہ وہ بڑے شاعر بن گئے۔ موجودہ دور میں بڑی شاعری تو کہیں نظر نہیں آتی مگر بڑے شاعروں کی بھرمار ہے۔ بڑی شاعری کس کام کی کہ کتابوں میں بند پڑی رہتی ہے لیکن بڑے شاعر کسی فعل میں بند نہیں ہیں۔ وہ مشاعروں کی واہ سمیٹنے سے لے کر پرائڈ آف پرفارمنس حاصل کرنے کی دوڑ میں شریک ہونے تک ہر کام میں آگے آگے رہتے ہیں اور اتنی دور نکل جاتے ہیں کہ شاعری گرد راہ کی طرح پیچھے رہ جاتی ہے''۔(.....عظمت اور شاعرانہ درویشی)

تحریر کی طرح ان کی گفتگو بھی مزے دار ہوتی تھی۔ مزے دار کیا بس یوں سمجھیے کہ فقروں کی پھول جھڑیوں سے آتش بازی کا سماں ہوتا۔

مطالعہ اور حافظہ دو اضافی صفات تھیں۔ خیر پڑھے لکھے تو اور بھی کئی ادیب مل جاتے ہیں مگر اچھی یادداشت کم کم ہی نصیب ہوتی ہے۔ ایسے ایسے نادر حوالے، ادبی معلومات، شخصیات کے بارے میں قابل ذکر (اور نا قابل ذکر) کوائف۔ الغرض! ان سے گفتگو کسی لائبریری سے گفتگو کے مترادف تھی۔

خواجہ صاحب بہت اچھے فوٹو گرافر بھی تھے، یہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے۔ ان کا کیمرہ ہمیشہ ساتھ رہتا جہاں کہیں کام کا ادیب ملا اس کی تصویریں بنا ڈالیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے سبھی قابل ذکر اہل قلم کی تصویریں انہوں نے اتاری ہوں گی۔ انہیں کلوز اپ بنانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ یہ لکھ رہا ہوں اور یاد آ رہا ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر وحید قریشی بھی مشفق خواجہ کی مانند محقق ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست فقرے باز اور فوٹو گرافر بھی ہیں۔

میں نے کتابوں کے بڑے بڑے عشاق دیکھے ہیں بلکہ ایسے عاشق جو مستعار اور مسروقہ کتاب سے بھی پرہیز نہیں فرماتے مگر مشفق خواجہ اس ضمن میں استثنائی مثال تھے کہ کتاب خریدتے اور ضرورت مندوں کو مفت تقسیم کرتے۔ جس شخص نے ان کا کتب خانہ نہیں دیکھا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ناظم آباد میں ان کا تین منزلہ مکان کتابوں سے گویا چھلک رہا ہو، کتابیں، مخطوطات، خطوط سب قرینے سے دھرے، بلکہ کثیر التصانیف مصنفین کے نام لکھ کر ان کے لیے جداگانہ شیلف مخصوص کر رکھی تھیں۔ اپنے نام کی شیلف دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔

میں ٹرینڈ لائبریرین ہوں مگر میری ذرا سی آبجوہی کا کوئی اور چھور نہیں جبکہ ان کا محیط بے کراں محفوظ و پابند! جب تک مشفق خواجہ کے بہت قریب نہ ہوا نہیں سمجھنا آسان نہیں مثلاً طنزیہ کالموں کی بدولت ان کا امیج کچھ ایسا بن گیا تھا گویا وہ کوئی آدم خور قسم کے انسان ہوں۔ دراصل کالم نگاری تو ایک طرح سے دل پشوری کرنے کے مترادف تھی۔ چند فقرے لکھے اور ٹک دل شاد کیا۔ عام تاثر کے برعکس وہ بے حد محبت کرنے والے اور دوسروں کے دکھ درد میں شرکت کرنے والے اور اس سے بھی بڑھ کر دوسروں کی مالی اور اخلاقی مدد کرنے والے انسان تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ نہ صلے کا لالچ اور نہ شہرت کی تمنا۔ درویشی اور لاتعلقی

کے دعوے تو سبھی کرتے ہیں مگر بہت کم ایسے اہلِ قلم ملیں گے جو اپنے عمل سے اپنے دعووں کی توثیق بھی کر سکتے ہوں مگر مشفق خواجہ نے بے داغ عمل سے صلہ، انعام اور شہرت کو مسترد کر دیا۔ بہت پہلے رائٹرز گلڈ کی جانب سے ان کی ایک کتاب کو انعام ملا تو انہوں نے یہ کہہ کر انعام لینے سے انکار کر دیا کہ میں صلہ یا انعام کے لیے نہیں لکھتا۔ اس سلسلے میں میں بھی ایک بات کا گواہ ہوں۔ جب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں میں نے ایم فل کی کلاس کو پڑھانا شروع کیا، نصاب ختم ہونے اور سالانہ امتحان کے بعد تھیسس لکھنے کا مرحلہ آیا تو میں نے انہیں خط لکھ کر بر بنائے دوستی ان پر ایم فل کا تھیسس لکھوانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر انہوں نے مجھے سختی سے اس کام سے باز رہنے کو کہا، کہ بقول ان کے انہوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ ان پر تحقیقی مقالہ قلم بند کیا جائے۔ جامعات سے وابستہ اساتذہ اس بات کے شاہد ہیں کہ زندہ شخصیات پر ایم اے/ایم فل کی ڈگری کے حصول کے لیے تحقیقی مقالات کے لیے جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آتا ہے تو ''زندہ'' شخصیات کیسے کیسے دباؤ اور سفارشوں سے خود پر مقالہ لکھوانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود ہی طالب علم کو مقالہ لکھ دیتے ہیں۔ ایسے میں مشفق خواجہ صاحب کے انکار کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خالد احمد نے ماہنامہ ''بیاض'' میں ان کا گوشہ شائع کرنے کی بات کی تو اسے بھی انہوں نے منع کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادیب کسی بچہ نادان کی مانند شہرت کے کھلونوں کے لیے ہر دم مچلتا نہ رہے لیکن اگر بلا کوشش خود بخود کچھ مل جائے تو انکار بھی نہ کرنا چاہیے لیکن مشفق خواجہ شہرت کے معاملے میں انکار کی منزل سر کر چکے تھے۔ اسی لیے عمر قلب مطمئن کے ساتھ بسر کی۔ اب یہ الگ بات کہ قلب مطمئن قلب مریض بھی بن سکتا ہے۔ کھیڈ مقدراں دی!

میری ان کی دوستی کالم، دیباچہ، تبصرہ اور فلیپ کی سطح سے بہت بلند تھی۔ میں ان کے اسلوب کا رسیا تھا اور اچھے فقرے سے حظ اٹھاتا تھا خواہ ہدف میں ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لیے ہمارے تعلقات کی اساس باہمی خلوص اور محبت پر استوار رہی۔ اس ضمن میں ان کا ''جھکاؤ'' اور میرا ''جھکاؤ'' رخنہ اندازی کا باعث نہ بن سکے۔

میں طبعاً مجمع پسند نہیں۔ بھیڑ میں میرے اعصاب کشیدہ ہو جاتے ہیں، دوستوں کا ریوڑ پالنے کی مجھ میں سکت نہیں۔ گنتی کے چند احباب ہیں اور ان ہی کے ساتھ مل کر خوش ہوتا ہوں۔ کراچی میں مشفق خواجہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور نسیم درانی کے ساتھ ہی زیادہ تر وقت کٹتا ہے۔

کراچی پہنچتے ہی میں انہیں فون کرتا۔

''فرمائیے''

یہ ان کا مخصوص انداز تھا، وہ مجھے کہتے تم نے فلاں دن خالی رکھنا ہے، نہ کسی طرح کی تقریب اور نہ کسی کو وقت دینا۔ وہ گاڑی لے کر آ جاتے۔ ساتھ ان کے ہم زلف ذوالفقار مصطفیٰ۔ ہم سیدھے ساحل سمندر کا رخ کرتے۔ انہیں علم تھا کہ میں سمندر سے کیسے مسحور ہو جاتا ہوں اس لیے اور کہیں جانے کا پروگرام نہ بناتے۔ ہم تمام دن ساحل پر گزارتے۔ کھانا بھی وہیں کھاتے اور پھر رات گئے وہ مجھے گھر پہنچا دیتے۔ میں انہیں لاہور کے ''ٹوٹے'' سنا کر سال بھر کی ادبی ڈائری گوش گزار کرتا۔ وہ مجھے کراچی کے

حالات سے باخبر کرتے، ہم دونوں ہی کو یہ ایک دن بہت عزیز رہا۔ میرے لیے یہ ایک دن کراچی کے قیام کا حاصل ہوتا، ایک برس میں نہ آسکا تو انہوں نے خط لکھا کہ تم کراچی نہ آئے تو میرے لیے گویا دسمبر کا مہینہ ہی نہ آیا، دسمبر کا مہینہ اس لیے کہ میرا نیاز و نگار سیمینار کے سلسلہ میں دسمبر میں کراچی آنا ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ گیا تو بہت خوش ہوئے اور کہا آپ بہت اچھے موقع پر آئے۔ آج شام کلفٹن میں میری بہن کے ہاں رات کا کھانا ہے اور کراچی کے متعدد اہل قلم آرہے ہیں اسی بہانے ان سب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

وہ شام کو مجھے لینے آئے تو کہنے لگے ان دنوں کراچی کے حالات بہت خراب ہیں۔ رات کے بارہ ایک بجے کار ڈرائیونگ خطرے سے خالی نہیں۔ آپ رات وہیں گزار لیں۔ میں نے سلیپنگ سوٹ اٹھایا اور ان کے ساتھ چل دیا۔

ساحلِ سمندر پر خوب صورت فلیٹ کراچی کے ادیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ محترمہ خدیجہ مستور صاحبہ سے طویل مدت کے بعد وہیں ملاقات ہوئی، قبلہ مشتاق احمد یوسفی، عالی جی اور متعدد دیگر حضرات۔ یہ ایک یادگار تقریب تھی۔

سب چلے گئے میں کھڑکی میں سے چاندنی میں نہائی سمندر کی لہریں دیکھ رہا تھا۔ یہ عجیب منظر تھا۔ ہم دونوں باہر آ گئے اور دیر تک یوں ہی گھومتے رہے اور پھر ساحل پر جا پہنچے۔ سمندر کی وہ لہریں جو بند کمرہ کی کھڑکیوں سے مانند تصویر تھیں اب ہم ان کے شور سے شرابور ہو رہے تھے۔ وقت جیسے تھم گیا اور لمحات منجمد ہو گئے۔ سمندر کے کنارے اس رات ہم کتنی دیر تک بیٹھے، کیا باتیں ہوئیں، کچھ یاد نہیں لیکن اس رات کا تاثر ہنوز اعصاب میں مدوجزر پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد ہم جب کبھی بھی ملے ہم نے اس رات کو ضرور یاد کیا۔

میں یہ سمجھتا ہوں اور میں نے ان سے ایک مرتبہ اس کا اظہار بھی کیا کہ ان کے پاس جیسی شاندار لائبریری تھی، جتنی اچھی یادداشت تھی، جتنی تخلیقی صلاحیتیں تھیں اور جتنا زیادہ وقت تھا انہوں نے اس سے اتنا فائدہ نہ اٹھایا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے۔ ''کلیات یگانہ'' کی تدوین جیسے اور بھی متعدد کام کیے جا سکتے تھے۔

ان کا جواب یہ تھا کہ مجھے خود کام کرنے کے مقابلے میں اوروں سے کام لینے میں زیادہ مزا آتا ہے۔ تب انہوں نے متعدد ایسے افراد کے نام گنوائے جو ان سے کتابیں اور کوائف حاصل کر کے ''محقق'' کہلوائے۔ کتنے ان کے فیض سے مقدمہ نگار بن گئے اور کتنے مقالہ نگار۔ ایسے حضرات کی فہرست خاصی طویل ہے۔

ایک مرتبہ کراچی گیا تو انہوں نے لاہور کے ایک نوجوان سے ملوایا جو کئی ماہ سے ان کے ہاں مقیم تھا اور کتب خانہ اور دسترخوان دونوں سے کماحقہ انصاف فرما رہا تھا۔ خود میں نے ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے تھیسس لکھنے والے اپنے کئی طالب علموں کو ان کے پاس بھیجا اور سبھی شادکام واپس آئے۔ یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔ ہر وہ شخص جو کتابوں کا رسیا ہے اور محبت سے لائبریری بناتا ہے اس کے لیے کسی کو کتاب دینا آسان نہیں ہوتا اس لیے کہ ہمارے علم نا آشنا معاشرے میں کتاب واپس نہ کرنا ایک طرح کی شیخی سمجھا جاتا ہے اس حد تک کہ یاروں نے دوسروں کی کتابوں سے اپنی لائبریری تیار کر لی مگر خواجہ صاحب کا رویہ برعکس تھا۔

کتاب تو خیر یہ بھی نہ دیتے لیکن اس کی فوٹوسٹیٹ فوراً مہیا کر دیتے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے کھانے پینے اور پہننے کے اخراجات کے مقابلے میں فوٹوسٹیٹ کے اخراجات کہیں زیادہ ہوں گے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ممالک کے سکالران کی لائبریری سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔

مشفق خواجہ صحبت ناجنس سے الرجک تھے۔ اسی لیے ادیبوں اور ادیبوں کے اجتماعات، ادبی تقریبات، مشاعروں اور ضیافتوں سے خود کو محفوظ رکھا لیکن جنہیں وہ دوست سمجھتے تھے، جن سے پیار کرتے تھے یا جن کے علم، ذہانت یا شرافت کے قائل تھے ان کے لیے جی جان سے حاضر! وہ مجلسی انسان نہ تھے لیکن جس مجلس میں ہوتے وہاں صرف وہی بولتے کہ علم کی ہنڈیا میں طنز کا بگھار لگانے میں ماہر تھے، مگر وہ طنز برائے طنز نگار نہ تھے جیسا کہ میں نے اپنے ایک انٹرویو میں ان کے بارے میں یہ مصرع پڑھا تھا:

اسے جب سے ذوق شکار تھا اسے زخم سے سروکار تھا

دراصل ان کا طنز ادب سے ان کی کمٹمنٹ کا مظہر تھا۔ وہ ادب اور ادیب کو جس بلند منصب پر دیکھنے کے خواہش مند تھے جب وہ اسے اس سطح سے نیچے گرا دیکھتے تو رہا نہ جاتا۔ ادب و نقد، شعر و شاعری اور علم و دانش کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص تصورات تھے۔ لفظ کے بارے میں کیا خوب صورت بات کی:

''لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح انہیں عزت بھی ملتی ہے اور ذلت بھی۔ کبھی یہ معمولی حیثیت سے ترقی کر کے بلند مدارج تک پہنچ جاتے ہیں اور کبھی بلند مدارج سے گر کر معمولی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں.....''۔ (تاریخ یا ٹلے نویسی)

لفظ تحریر کی اساس بنتا ہے اور تحریر کتاب کی۔ دیکھیے کتاب کے حوالہ سے کیا کہتے ہیں:

''کسے معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جن کتابوں کا شائع ہونا نہ ہونا برابر ہے ان کا تو چرچا ہوگا اور جو کتابیں کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں ان کے نام سے بھی کسی کو واقفیت نہ ہوگی۔ ایسی ایسی کتابوں کی رونمائیاں ہوتی ہیں جو اگر کسی مہذب معاشرے میں شائع ہوں تو ان کے مصنف منہ چھپاتے پھریں مگر اب زمانہ ہی ایسا ہے کہ منہ چھپانے والے سر اٹھا کے چلتے ہیں کہ انہوں نے کتابیں شائع کر کے اپنا وقت اور پیسہ ضائع کیا''۔ (غالب ناشناسی)

تو ایسا تھا ناوک فگن اور ایسے تھے اس کے اہداف:

اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

# انتخاب خامہ بگوش

مشفق خواجہ

## ادبی خرکار

وہ دن گئے جب اردو ادب پر برصغیر کے چند بڑے شہروں کی اجارہ داری تھی۔ اب تو یہ زبان اور اس کے ادیب دنیا کے ہر خطے میں موجود ہیں اور بعض مقامات پر تو لاہور، کراچی، دہلی اور لکھنو جیسی ادبی چہل نظر آتی ہے۔ اردو کے بین الاقوامی مشاعرے تو منعقد ہوتے ہی تھے۔ اب بین الاقوامی رسالے بھی شائع ہونے لگے ہیں جن میں برصغیر سے باہر کے ادیبوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ تارکین وطن معاشی دباؤ کے تحت رزق کی تلاش میں غیر ملکوں میں جاتے ہیں تو ادب کے ذریعے ان کا تعلق اپنے وطن سے قائم رہتا ہے۔ ادبی رسالے بھی معاشی دباؤ کے تحت اس تعلق کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ کس طرح؟ اس کا اندازہ ذیل کی خط کتابت سے ہوگا جو ایک کرم فرما کی عنایت سے ہمیں پڑھنے کے لیے ملی تھی۔ جی نہ چاہا کہ ایسی بصیرت افروز خط کتابت سے ہم اکیلے محظوظ ہوں لہذا اہم اس کا کچھ حصہ اپنے قارئین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

﴿۱﴾

کراچی ۲ر فروری ۱۹۹۳ء

مکرمی خلیل بے خود صاحب۔ آداب۔ آپ نے ماہنامہ ''خرکار'' کا سالانہ زرتعاون عنایت کر کے ادب نوازی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کی وجہ سے تاریخ ادب میں آپ کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ اگر آپ اس تاریخ میں اپنا نام آب زر سے لکھوانا چاہتے ہیں تو رسالے کی تاحیات سرپرستی قبول فرمائیے۔ اس کے نرخ منسلکہ ریٹ کارڈ پر درج ہیں۔ آپ نے سالانہ زرتعاون کے ڈرافٹ کے ساتھ جو خط بھیجا ہے، اس کی خوب صورت نثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ شاعر ہیں نیز آپ کے شاعرانہ نام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ازراہ کرم اپنا کلام مع تصویر عنایت فرمائیے تاکہ دنیائے ادب کے سامنے مستقبل کے ایک بڑے شاعر کو فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ واضح رہے کہ ہمارے ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے سعودی عرب، خلیج کی ریاستوں، یورپ، کینیڈا اور امریکہ میں آباد برصغیر کے بے شمار باشندوں کے اندر چھپے شاعروں کو برآمد کیا ہے۔ یہ تمام شاعر آج اردو دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ آپ کے اندر کے خوب صورت شاعر کو بھی باہر آنا ہوگا۔

خرکار نوازی کا ایک مرتبہ پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ ہی جیسے صاحبان عزم و ہمت کی وجہ سے اردو عالمی سطح پر مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کے جواب کا بے تابی سے انتظار کروں گا۔ آپ کا خیر اندیش۔ مینا لکھنوی

﴿۲﴾

دوبئی۔ ۱۵/فروری ۱۹۹۳ء

محترمی۔ تسلیمات۔ گرامی نامہ موصول ہوا۔ یادفرمائی کے لیے شکرگزار ہوں۔ آپ نے میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، مگر جناب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں شاعر نہیں ہوں۔ میرا نام آپ کو شاعرانہ اس لیے نظر آیا کہ میں حضرت بے خود گڈھ مکتیشری کا فرزند ہوں۔ میرا اصل نام خلیل اللہ خاں ہے، اسے میں نے مختصر کر کے والد مرحوم کے تخلص سے جوڑ دیا ہے۔ میں پیشے کے اعتبار سے انجینیر ہوں۔ افسوس کہ ایک شاعر کا بیٹا ہونے کے باوجود شعر کہنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ البتہ اردو زبان سے بے پناہ محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے ایک دوست نے آپ کے رسالے کا سالانہ چندہ بھیجنے کے لیے کہا تو میں نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔ آپ مجھے رسالے کا سرپرست بنانا چاہتے ہیں تو مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس کا ہدیہ بھی پیش کر رہا ہوں۔ غزل میں نے کبھی نہیں لکھی، اس لیے بھیجنے سے معذور ہوں، البتہ آپ کی خواہش کے احترام میں اپنی تصویر بھیج رہا ہوں۔ فی الحال اپنے رسالے میں اسی کی اشاعت پر اکتفا کیجیے۔ مخلص خلیل بے خود۔

﴿۳﴾

کراچی ۸/مارچ ۱۹۹۳ء

عزیزی خلیل بے خود صاحب۔ سلام و رحمت۔ سرپرستی کی رقم کا ڈرافٹ ملا اور تصویر بھی۔ دونوں کے دیدار سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ غلط فہمی مجھے نہیں آپ کو ہوئی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت بے خود گڈھ مکتیشری کا فرزند ارجمند شاعر نہ ہو۔ میں نے آپ کی تصویر کو بغور دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے اندر ایک طرح دار شاعر موجود ہے۔ آپ اس شاعر کو باہر نکالیے۔ اگر کسی وجہ سے اس کے باہر نکلنے میں کچھ دیر ہے تو میں آپ کے لیے غزلوں کا انتظام کر سکتا ہوں۔ بلکہ کر لیا ہے۔ میرے عزیز دوست فرصت ناگ پوری میرے ساتھ ہی کام کرتے ہیں۔ ان سے آپ کے لیے چند غزلیں لکھوائی ہیں ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ ایک ایک کر کے انہیں ''خرکار'' میں شائع کرتا رہوں گا۔ آپ اس دوران مقامی مشاعروں اور شعری نشستوں میں شرکت شروع کر دیجیے۔ ان شاء اللہ بہت جلد آپ بطور شاعر مشہور ہو جائیں گے۔ فرصت ناگ پوری صاحب کو غزلوں کا کچھ معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ ان کے لیے آپ جو رقم بھیجیں، اس کا ڈرافٹ میرے نام ہونا چاہیے۔ میں ایک دم ساری رقم ان کے حوالے نہیں کروں گا کیوں کہ آیندہ بھی غزلیں لکھوانی ہوں گی۔

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ حضرت بے خود گڈھ مکتیشری کے فرزند دل بند ہیں۔ میں نے قیام پاکستان سے چند ماہ پہلے انہیں سندیلہ کے سالانہ مشاعرے میں دیکھا تھا۔ سبحان اللہ کیا کلام تھا اور پڑھنے کا انداز بھی کیسا دل نشین تھا۔ ان کا نورانی چہرہ اور خوب صورت آواز اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ وہ میرے حال پر بہت مہربان تھے۔ اسی رشتے سے میں نے آپ کو ''محترمی'' کی بجائے ''عزیزی'' لکھا ہے۔ ان شاء اللہ آپ ہمیشہ عزیز ہی رہیں گے۔ اچھا اب اجازت دیجیے۔ اس وقت زیادہ نہیں لکھا جا رہا کیوں کہ میرا قلم خاصا پرانا ہو گیا ہے اور لکھنے میں دقت ہوتی ہے۔ دعا گو۔ مینا لکھنوی۔

﴿۴﴾

دوبئی۔۲۳/مارچ ۱۹۹۳ء

بزرگوار محترم۔سلام مسنون۔آپ کا محبت نامہ ملا اور غزلیں بھی۔والد مرحوم سے تعلق خاطر کا آپ نے خوب خیال رکھا۔نہایت عمدہ غزلیں ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فرصت ناگ پوری نے میرے ہی خیالات وجذبات کو منظوم کر دیا ہے۔ یہ غزلیں پڑھ کر میرے اندر چھپا ہوا شاعر باہر آ گیا ہے۔اس کی طرف سے بھی سلام قبول کیجیے۔حضرت فرصت ناگ پوری کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔امید ہے وہ آئندہ بھی میرے حال پر کرم فرماتے رہیں گے۔مجھ سے جو خدمت ہو سکے گی، اس سے دریغ نہیں کروں گا۔منسلکہ ڈرافٹ انہیں کے حساب میں بھیج رہا ہوں۔میرے ایک دوست کے دوست یہاں مشاعروں کا کاروبار کرتے ہیں۔ہر سال کسی شاعر کا جشن مناتے ہیں اور پاک وہند کے بہت سے شاعروں کو بلا کر مشاعرہ بازی کرتے ہیں۔ عنقریب یہ مشاعرہ ہونے والا ہے۔کوشش کروں گا کہ اس میں غزلیں سنانے کا موقع مل جائے۔

''خرکار'' کے جس شمارے میں میری غزل شائع ہو، اس کی دس کاپیاں قیمتاً بھجوا دیا کیجیے۔اپنا پرانا قلم پھینک دیجیے۔ میرے ایک دوست کراچی جانے والے ہیں، ان کے ہاتھ نیا قلم بھجواؤں گا۔کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔نیاز مند۔ خلیل بےخود۔

﴿۵﴾

کراچی ۳/نومبر ۱۹۹۳ء

عزیز گرامی قدر۔خوش رہیے۔گزشتہ چند مہینوں میں آپ نے اردو دنیا میں جو نام پیدا کیا ہے، اس پر میں جتنا فخر کروں کم ہے۔آپ کی غزلوں کی تعریف میں ''خرکار'' کے دفتر میں روزانہ آٹھ دس خط موصول ہوتے ہیں۔فرصت ناگ پوری نہایت توجہ سے آپ کے لیے فکر سخن کر رہے ہیں۔انہوں نے یہ معمول بنا لیا ہے کہ ہفتے میں دو دن صرف آپ ہی کا کام کرتے ہیں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ وہاں کے مشاعروں اور شعری نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں اور بطور شاعر آپ کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔آپ کے اس خیال سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے کہ آپ کا مجموعہ کلام اب شائع ہو جانا چاہیے۔ڈاکٹر منیف ذوق کی بھی یہی رائے ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ جب تک آپ کا مجموعہ شائع نہیں ہوگا، اس وقت تک اہل ادب کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کس درجے کے شاعر ہیں۔ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ فیض کے بعد آپ ہی وہ شاعر ہیں جس کے ہاں عصری حسیت عروج پر نظر آتی ہے۔آپ کا دیوان میں مکتبہ خرکار سے چھاپوں گا۔اگر کچھ رقم پیشگی مل جائے تو فوراً کتابت شروع کرا دی جائے گی۔ان شاءاللہ دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی۔

آپ نے رسالے کے خریدار بنانے میں خرکار نوازی کا جو ثبوت دیا ہے، اس کا شکریہ ادا کر کے میں آپ کے خلوص کو آلودہ رسمیات نہیں کرنا چاہتا۔میری دعا ہے کہ خدا آپ کو ایسی نیکیوں کی مزید توفیق دے۔آمین۔دعا گو۔مینا لکھنوی۔

﴿۶﴾

دوبئی ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۳ء

بزرگوار محترم۔ آپ کا ہر خط سیروں خون بڑھا دیتا ہے۔ بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے دیوان کی اشاعت کی ذمہ داری قبول فرمالی ہے۔ اخراجات کی آپ بالکل پروانہ کریں۔ بس اس کا خیال رکھیں کہ گیٹ اپ ایسا ہو کہ جو بھی دیکھے دیکھتا ہی رہ جائے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ڈاکٹر حنیف ذوق میری شاعری کے بارے میں اتنی عمدہ رائے رکھتے ہیں۔ مجھے فیض کے برابر جگہ دینا ان کے صاحب علم ونظر ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ڈاکٹر صاحب میرے دیوان کا دیباچہ لکھ دیں۔ اس سلسلے میں جو خدمت میرے لائق ہو تحریر فرمایئے۔ فلیپ آپ کس سے لکھوائیں گے؟ میری حقیر رائے یہ ہے کہ دائیں طرف کا فلیپ آپ خود لکھیں اور بائیں طرف کا حضرت فرصت ناگ پوری سے لکھوائیں۔ آپ دونوں بزرگ میرے دائیں بائیں ہوں گے تو میرے ادبی قد وقامت میں اضافہ ہوگا۔ عقبی سرورق پر میری تصویر ہونی چاہیے اور تصویر کے نیچے میرے حسب حال میرا ہی کوئی شعر ہو۔ شعر کا انتخاب حضرت فرصت ناگ پوری پر چھوڑتا ہوں کہ وہ میرے شعری مزاج کو خوب سمجھتے ہیں۔

دیوان کے مصارف طباعت کا تخمینہ معلوم ہو جائے تو پوری رقم یک مشت ارسال کردوں گا۔ فی الحال کام شروع کرنے کے لیے کچھ رقم بھیج رہا ہوں اور ہاں دیوان کی رونمائی کس انداز سے ہوگی؟ اس کی کچھ تفصیل لکھیے تاکہ میں اس جہت میں کوئی عملی اقدام اٹھا سکوں۔ آپ کا خادم۔ خلیل بے خود۔

﴿۷﴾

کراچی ۱۵ر جنوری ۱۹۹۴ء

عزیز مکرم۔ دعائیں۔ خط کا جواب لکھنے میں تاخیر ہوئی، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل میں اس دوران آپ ہی کے کام میں مصروف رہا۔ دس بارہ کاتبوں سے کتابت کے نمونے حاصل کیے اور ماہرین کی ایک کمیٹی کے سامنے پیش کیے۔ کوئی نمونہ پسند نہ آیا تو یہ طے پایا کہ آپ کا دیوان نوری نستعلیق میں کمپوز کرایا جائے۔ کام شروع ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ اگلے ایک ماہ میں کمپوزنگ کا کام مکمل ہو جائے گا۔ توقع ہے کہ مارچ کے آخر تک کتاب چھپ جائے گی۔ اخراجات کا تخمینہ الگ کاغذ پر لکھ دیا ہے۔ اسے آپ ملاحظہ کر لیجیے۔

ڈاکٹر حنیف ذوق نے دیباچہ لکھ دیا ہے اور اب وہ اس پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے آپ کی شاعری میں ترقی پسند عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ اتنی اہم کتاب میں ایک دیباچہ کم پڑے گا۔ کم از کم ایک دیباچہ اور ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ اسلام آباد سے نظیر صدیقی نے محبوب خزاں کی شاعری پر ایک مضمون ''خرکار'' میں اشاعت کے لیے بھیجا ہے جو خزاں کی شاعری سے زیادہ آپ کی شاعری کی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ مضمون میں جہاں جہاں خزاں کا نام آیا ہے وہاں ہر جگہ میں نے آپ کا نام لکھ دیا ہے۔ خزاں کے جو اشعار نمونۃً پیش کیے گئے تھے ان کی جگہ آپ کے اشعار درج کر دیے ہیں۔ نظیر صدیقی سے میرے مراسم بہت گہرے ہیں، اس لیے انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا

بلکہ جب میں انہیں اس دیباچے کا معاوضہ بھیجوں گا تو وہ بہت خوش ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ یہ پیشکش کریں کہ انہوں نے فیض پر جو مضمون لکھا تھا، اسے بھی مناسب قطع و برید کے بعد آپ کے حسب حال بنالیا جائے۔

دیوان کی رونمائی بڑے پیمانے پر ہوگی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں پہلے جلسہ ہوگا اور پھر عشائیہ۔ آج کل لوگ ایسی تقریبات میں عشائیے ہی کی وجہ سے شریک ہوتے ہیں۔ اس کا تخمینہ بھیج رہا ہوں۔

اگلے سال ''خرکار'' کی اشاعت کے پچاس سال پورے ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کی گولڈن جوبلی منانے کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ کے دیوان کی رونمائی کے موقع پر ایک بروشر شائع کیا جائے گا جس میں صنعتی و تجارتی اداروں اور بنکوں کے اشتہارات ہوں گے۔ اشتہارات کی ساری آمدنی آپ کی طرف سے گولڈن جوبلی فنڈ میں بطور عطیہ دے دی جائے گی۔ اس سے ملک کے ادبی حلقوں میں آپ کی عزت اور وقار میں اضافہ ہوگا۔ یہاں کے اداروں کے اشتہار تو میں حاصل کرلوں گا، البتہ خلیج کی ریاستوں سے اشتہارات آپ ہی کو حاصل کرنے ہوں گے۔ وہاں کے کئی ادارے یہاں کے اخباروں میں اشتہارات شائع کراتے رہتے ہیں۔ اگر ایسے آٹھ دس اداروں کے اشتہار بھی مل جائیں تو گولڈن جوبلی شان دار پیمانے پر منائی جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دیوان کی رونمائی میں آپ کی شرکت لازمی ہوگی۔ آپ یہاں تشریف لائیں گے تو آپ کے اعزاز میں دعوتیں بھی ہوں گی۔ ان دعوتوں کے اخراجات تخمینے میں شامل نہیں کیے گئے۔ یہ بات اس لیے آپ کے کان میں ڈال دی ہے کہ اخراجات کی یہ مد بھی آپ کے پیش نظر رہے۔ دعا گو۔ مینا لکھنوی۔

(۱۳/جولائی ۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆☆

## ردّیات ادب کے سالانہ جائزے

اردو ادب کی تاریخ میں معرکہ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ میر تقی میر سے لے کر ڈاکٹر انور سدید تک شاید ہی کوئی اہم ادیب ہوگا جس کی اپنے کسی معاصر سے ان بن نہ ہوئی ہو اور طرفین نے ایک دوسرے کے خلاف دل کا غبار صفحہ قرطاس پر منتقل نہ کیا ہو۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں کئی ادبی معرکہ آرائیوں کا ذکر نمک مرچ لگا کر کیا ہے اور آزاد سے تقریباً پچاس پچپن سال پہلے لکھنو کے ایک شاعر سعادت خان ناصر نے تو ''خوش معرکہ زیبا'' کے نام سے ایک پورا تذکرہ ہی لکھ ڈالا تھا جس میں متعدد ادبی معرکہ آرائیوں کا چشم دید احوال ملتا ہے۔ اس سلسلے میں اور بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ''نقوش'' کا ادبی معرکہ نمبر تو اس موضوع پر ان سائیکلوپیڈیائی کام ہے۔ ان سب چیزوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی ادبی جھگڑا سال دو سال سے زیادہ نہیں چلا۔ فریقین میں یا تو صلح کرادی گئی یا پھر دونوں تھک ہار کر خاموش ہو گئے۔

اردو کا دلچسپ ترین ادبی معرکہ وہ ہے جو گزشتہ پچیس برسوں سے ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کے درمیان جاری ہے۔ دونوں شریف آدمی ہیں مگر شرافت کا الگ الگ معیار رکھتے ہیں۔ ہمیں ان دونوں سے محبت ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا معیار شرافت، ان دونوں کے معیار سے جداگانہ نوعیت کا ہے۔ سنا ہے آج کل لاہور میں معرکہ سدید و سلیم کی سلور جوبلی منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دونوں ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، اسے کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا اور پھر اس کتاب کی تقریب رونمائی میں دونوں کو مدعو کیا جائے گا اور انہیں آمنے سامنے بٹھا کر اپنا اپنا موقف بیان کرنے

کی درخواست کی جائے گی بشرطے کہ کوئی موقف ہو۔ یہ بات ہم نے اس لیے لکھی ہے کہ اکثر جھگڑے اختلاف رائے کی وجہ سے نہیں، افتادِ طبع کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔

کتاب کی اشاعت کی حد تک تو ہم اس تجویز سے متفق ہیں کہ بہت سی نادر و نایاب، دلچسپ اور فکر انگیز تحریریں ایک مرتبہ پھر پڑھنے کو مل جائیں گی اور دونوں کے بہت سے ''محاسن'' جنہیں ہم بھول چکے ہیں، دوبارہ ذہن میں تازہ ہو جائیں گے لیکن دونوں کو آمنے سامنے بٹھانے کی بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب دینے کی بجائے ہم ایک واقعہ بیان کیے دیتے ہیں۔

تیس بتیس سال پہلے کی بات ہے کہ مشہور شاعر مصطفیٰ زیدی نواب شاہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ انہوں نے ایک ادبی کانفرنس منعقد کی اور اس میں جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی کو مدعو کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ان دونوں میں زبردست معرکہ آرائی ہو رہی تھی۔ مصطفیٰ زیدی نے ان دونوں بزرگوں کو کراچی سے نواب شاہ لے جانے کا کام طفیل احمد جمالی کے سپرد کیا (افسوس کہ اب لوگ جمالی کو بھول گئے، ایک زمانے میں وہ اپنی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کی وجہ سے بے حد مقبول تھے) سفر ریل گاڑی سے کرنا تھا، اس لیے جمالی نے ایک گاڑی سے جوش صاحب کو روانہ کیا اور دوسری سے شاہد صاحب کو لے کر وہ خود نواب شاہ پہنچے۔ مصطفیٰ زیدی نے جمالی سے کہا: ''اگر آپ ان دونوں کو ایک ہی گاڑی سے لے کر آتے تو مجھے استقبال کے لیے دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن پر آنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی''۔ جمالی نے جواب دیا ''آپ کو اپنی زحمت کا تو خیال ہے لیکن اس کا خیال نہیں کہ اگر یہ دونوں بزرگ ایک ساتھ سفر کرتے اور راستے میں ان کے درمیان صلح ہو جاتی تو اس حادثے کا کون ذمہ دار ہوتا؟''۔

اس واقعے سے جو اخلاقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اس کی بنا پر ہمارا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کو کسی محفل میں یک جا نہیں ہونا چاہیے۔ آنکھ کی مروت بڑی ظالم چیز ہے جس کی وجہ سے آدمی غلط فیصلے کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر مجوزہ کتاب کی تقریب رونمائی میں آمنے سامنے بیٹھ کر ان دونوں نے کوئی غلط فیصلہ کر لیا تو اردو ادب کی تاریخ کا دلچسپ ترین ادبی معرکہ قبل از وقت اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔

اخبار ''جنگ'' لاہور کے ادبی صفحے کے نگراں حسن رضوی اس قسم کے معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ۲۴ اکتوبر کے اخبار میں ہمارے ممدوحین کا ایک مشترکہ انٹرویو شائع کیا ہے۔ مشترکہ ان معنوں میں کہ ایک ہی سوال نامہ دونوں کے سامنے رکھا گیا اور اس کے جوابات الگ الگ حاصل کیے گئے۔ اس انٹرویو کی تمہید میں حسن رضوی لکھتے ہیں: ''ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ خوف فساد کے پیشِ نظر دونوں کو کسی ایک جگہ آمنے سامنے بٹھا کر ریکارڈ کرنے کی بجائے الگ الگ جگہوں پر ریکارڈ کیا گیا ہے۔ تاہم ادب کے ان ممتاز ناقدین کے انٹرویوز ایک ساتھ شائع کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ادب کے سنجیدہ حلقوں کو ادب کے پس منظر اور پیش منظر میں کام کرنے والے ادبی گروہوں اور ادبی مفادات نیز ان کے تصادم سے پیدا ہونے والی صورت حال سے آگاہ کیا جا سکے''۔

ان دونوں سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ آپ کیوں لکھتے ہیں؟ ڈاکٹر انور سدید نے اس رسمی سوال کا جواب بھی رسمی سا دیا جو یہ ہے: ''پڑھتے وقت ذہن میں کچھ نئے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں، لکھتے وقت ان سوالات کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں''۔ ہمارا تجربہ ڈاکٹر انور سدید سے بالکل مختلف ہے۔ ہم خالی الذہن ہو کر پڑھتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ کوئی گرہ پیدا ہی نہیں ہوتی جس کھولنے کے لیے لکھنے کی ضرورت پیش آئے۔ لکھتے ہم اس لیے ہیں کہ ہمارے خالی الذہن ہونے کا دستاویزی ثبوت موجود رہے۔ ڈاکٹر انور سدید ہمارے مقابلے پر خاصے خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس سوچنے والا ذہن ہے، ذہن میں سوالات ہیں، سوالات میں

گرہیں ہیں، اور ہر گرہ کی گرہ میں بے شمار ادبی مسائل ہیں۔ یہ سب مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں سوائے ایک مسئلے کے جس کا نام ہے ڈاکٹر سلیم اختر۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے مذکورہ سوال کا جواب دیتے ہوئے اپنے حریف کی طرح ادیبانہ تکلف سے کام نہیں لیا۔ جو اصل حقیقت تھی صاف صاف بیان کر دی۔ فرمایا: ''لکھنا میرے لیے ایک طرح کا نشہ ہے''۔ ڈاکٹر صاحب کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ نشہ حد اعتدال سے بڑھ گیا ہے، تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نشے سے انہیں کوئی نقصان پہنچا ہے۔ حالاں کہ نشہ اور نقصان لازم و ملزوم ہیں۔ ادب کا نشہ بھی کیا نشہ ہے کہ اس میں چُور ہو کر لکھنے والا تو عالم سرور میں رہتا ہے اور سارے نقصان پڑھنے والوں کے حصے میں آتے ہیں۔

ایک سوال یہ تھا: ''موجودہ عہد میں تنقید کو خوشامد سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ دونوں نے حیرت ناک حد تک اس سوال کا یکساں جواب دیا ہے۔ دونوں کا خیال یہ ہے کہ اگر کتابوں کی تقاریب رونمائی پر پابندی لگا دی جائے اور ادیبوں کے ساتھ شامیں منانے کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو تنقید ہی نہیں پورا ادب صحت مند ہو جائے گا۔

ہم نہایت ادب کے ساتھ دونوں ڈاکٹروں سے اختلاف کی جرأت کریں گے۔ یہ صحیح ہے کہ تقریباتی تنقید نے ہمارے ادب کو ایک مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار کر دیا ہے لیکن اس تنقید کے بارے میں کیا خیال ہے جو دوستوں کی کتابوں پر لکھی جاتی ہے اور جو جلسوں میں تو نہیں پڑھی جاتی لیکن رسالوں میں چھپوا دی جاتی ہے۔ دونوں ڈاکٹروں نے اپنے دوستوں اور ان کی بے شمار کتابوں پر مضامین لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی مضمون ایسا نہیں ہے جس میں دوستی کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تعریف جلسوں میں ہو تو بری، رسالوں میں ہو تو مستحسن۔ اگر تقریباتی یا فرمائشی تنقید کی طرح دوستانہ تنقید پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بہت سے نقاد لکھنے سے دست بردار ہو کر شریفانہ مشاغل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

دونوں ڈاکٹر ہر سال ادبی جائزے لکھتے ہیں جنہیں ڈاکٹر سلیم اختر ہماری خوشی کی خاطر ''ناجائزے'' کہنا پسند کرتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان سالانہ جائزوں کے حوالے سے جو سوال کیا گیا اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے اپنے حریف کی خدمات کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں: ''گارساں دتاسی کے بعد سب سے زیادہ سالانہ جائزے میں نے اور سلیم اختر نے لکھے ہیں''۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر ڈاکٹر انور سدید کو اپنی اور سلیم اختر کی تعریف ہی کرنی تھی تو بے چارے گارساں دتاسی کی روح کو شرمندہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ دتاسی نے اردو کے مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر جو معلومات فراہم کیں، وہ ہمارے ادب کی تاریخ کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے دونوں ڈاکٹروں کی فراہم کردہ معلومات پر اس وقت تک اعتبار نہیں کیا جا سکتا جب تک دوسرے ذرائع سے ان کی تصدیق نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ڈاکٹروں کے سالانہ جائزے ادب سے زیادہ ردیاتِ ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔

معترضین کی اس سفاکانہ رائے سے ہمیں اتفاق نہیں۔ گارساں دتاسی کی روح شرمندہ ہوتی ہے تو ہو، یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ڈاکٹروں نے جائزہ نگاری کو باقاعدہ ایک فن بنا دیا ہے۔ اس فن کی قدر آج نہیں تو کل ضرور ہوگی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ ان جائزوں کا ''اصل فائدہ آج سے دس بیس برس بعد ظاہر ہوگا جب ان جائزوں کی مدد سے کتابوں کے سنین یا کوائف وغیرہ متعین کرنے میں مدد ملے گی''۔

بعض کج فہم معترض یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ان جائزوں میں جن کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ آیندہ دس بیس برسوں میں ضائع ہو چکی ہوں گی اور ان کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ یہ جائزے ہی رہ جائیں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو کتابیں دس بیس برسوں بعد ضائع ہونے والی ہیں، ان کے بارے میں جائزے لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر اس کی بھی کیا ضمانت ہے کہ دس بیس برس بعد یہ جائزے بھی ضائع نہیں ہو جائیں گے۔

معترضین کی خدمت میں عرض ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز فانی ہے۔ اگر بہت سے فانی انسانوں کی سوانح عمریاں لکھی جا سکتی ہیں تو آیندہ برس بیس برسوں میں فنا ہو جانے والی کتابوں کے سنین طباعت اور دیگر کوائف کیوں نہیں محفوظ کیے جا سکتے۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کریں گے۔ اگلے بیس برسوں میں ''بفرضِ محال'' نظیر صدیقی کی ساری کتابیں ضائع ہو جائیں تو ہم دونوں ڈاکٹروں کے سالانہ جائزوں کی مدد سے ضائع شدہ کتابوں کا سراغ لگا سکتے ہیں بشرطے کہ اس کام سے پہلے خود جائزے ہی ضائع نہ ہو گئے ہوں۔

ان جائزوں کے ذریعے ڈاکٹر سلیم اختر نے جو نقصانات اٹھائے ہیں، ان کی تفصیل انہیں کے الفاظ میں یہ ہے: ''جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو میری بہت سی مخالفتیں، دشمنیاں اور گالیاں صرف اس سالانہ ادبی جائزوں کی وجہ سے ہیں، کتنی ہی کوشش کرو تمام کتابوں کا تذکرہ ناممکن ہوتا ہے، کیوں کہ کتابوں تک رسائی ہی ناممکن ہوتی ہے۔ اب جس کی کتاب کا ذکر رہ گیا وہ ساری عمر کے لیے دشمن بن گیا..... اس جائزہ نگاری میں میرے لیے سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے''۔

ہماری دلی ہمدردیاں ڈاکٹر سلیم اختر کے ساتھ ہیں۔ افسوس کہ انہیں ان کی محنت کا صلہ مخالفتوں، دشمنیوں اور گالیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر برا نہ مانیں تو ہم مشورہ دیں گے کہ انہیں قناعت سے کام لینا چاہیے۔ جتنا صلہ اب تک مل چکا ہے، آیندہ زندگی میں اسی کو کام میں لائیں، مزید کی ہوس نہ کریں، صرف وہی ادبی کام کریں جسے آنے والے برسوں میں ناجائزوں کی وجہ سے نہیں اپنی ادبی قدر و قیمت کی وجہ سے یاد رکھا جائے۔

(۱۶ نومبر ۱۹۹۵ء)

☆☆☆☆☆

## شاعری پر شب خون

شمس الرحمٰن فاروقی اردو کے ان چند نقادوں میں سے ہیں جنہیں صحیح معنوں میں رجحان ساز نقاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی گواہی محمد حسن عسکری بھی دے چکے ہیں۔ جنہوں نے ایک مرتبہ یہ لکھا تھا کہ حالی کے بعد اردو تنقید فاروقی کے ذریعے ایک نئے معیار سے آشنا ہوئی ہے۔ فاروقی کا مطالعہ حیران کن حد تک وسیع ہے۔ وہ بیک وقت مشرق و مغرب کی ادبی روایات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ انہیں عروض اور معانی و بیان جیسے بے برکت علوم پر بھی ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔

فاروقی ۱۹۶۶ء سے رسالہ ''شب خون'' شائع کر رہے ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں اس رسالے نے جدید ادبی رجحانات کو متعارف کرانے میں اور جدید ادیبوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ''شب خون'' رسالہ نہیں ایک تحریک ہے جو اردو ادب میں نئے خیالات و رجحانات کی آب یاری کر رہی ہے۔ جس طرح زلزلے اور سیلاب جیسی آفات ارضی کے متاثرین بے شمار ہوتے ہیں، اسی طرح ''شب خون'' سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے۔

جدیدیت اور جدیدیوں سے ہماری کوئی ذہنی قربت نہیں ہے۔ ہم پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ ہمیں کسی جدید چیز میں اس وقت تک کوئی خوبی نظر نہیں آتی جب تک اس پر قدامت کی گرد جم نہ جائے۔ فاروقی کو بھی ہم نے اسی لیے پسند کیا ہے کہ انہیں لکھتے ہوئے ۴۰، ۴۵ برس گزر چکے ہیں۔ اپنی ساری قدامت پسندی کے باوجود ہم ''شب خون'' کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ جب بھی اس کا تازہ شمارہ آتا ہے تو ہم سب کام چھوڑ کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں اور مطالعے کے بعد بھی سب کام چھوڑنے پڑتے ہیں کیوں کہ کچھ دنوں تک ہم اس لائق نہیں رہتے کہ کوئی کام کر سکیں۔ حال ہی میں خوش قسمتی سے ''شب خون'' کے پانچ شمارے ایک ساتھ ملے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ دولت بھی وہ جس کے بارے میں یگانہ نے کہا تھا:

دنیا کا کیا بھروسا، دولت کا کیا ٹھکانا
دولت تو دولت آخر لٹنے کی نوبت آئی

سو اس دولت کو بے دریغ لٹانے کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

''شب خون'' کے تازہ شماروں میں سے کسی ایک میں اختر الایمان کا وہ معرکہ آرا انٹرویو بھی شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے اقبال، فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور دوسرے کئی شاعروں کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہترین اردو شاعری، پاکستان میں نہیں، ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ اختر الایمان کا یہ فیصلہ پاکستانی شاعروں کو ضرور ناگوار گزرے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ ہماری شاعری کا مطالعہ کیے بغیر یک طرفہ فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ آزردہ خاطر نہ ہوں، اختر صاحب نے جو فیصلہ دیا ہے، اس کے لیے انہیں پاکستانی تو کیا، ہندوستانی شاعری بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ فیصلہ اختر صاحب نے اپنی شاعری کے حوالے سے دیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں، اگر وہ بھوٹان کے باشندے ہوتے تو پھر بہترین شاعری وہیں ہو رہی ہوتی۔

ہم نے چوں کہ انصاف پسند طبیعت پائی ہے، اس لیے ہمارے دل نے یہ گواہی دی کہ اختر الایمان جیسا بڑا شاعر غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا۔ انہوں نے جو کچھ فرمایا ہے یقیناً اس کی بنیاد ٹھوس دلائل پر نہیں ٹھوس حقائق پر ہوگی۔ صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہم نے ''شب خون'' کے پانچوں شماروں میں شائع شدہ غزلوں کو بغور پڑھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اختر صاحب مطالعے کے بغیر جس نتیجے پر پہنچے تھے، مطالعے کے بعد ہمیں اسی نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اب ہماری بھی یہی رائے ہے کہ بہترین اردو شاعری ہندوستان ہی میں ہو رہی ہے، پاکستانی شاعر خواہ مخواہ اپنا اور پڑھنے والوں کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ ہندوستانی شاعروں کی تقلید کر کے اپنی شاعری کو بہتر بنائیں، ورنہ کوئی دوسرا آبرومندانہ شغل اختیار کریں تاکہ سیاست کی طرح شاعری بھی ہمارے ملک کی رسوائی کا باعث نہ ہو۔

ہندوستان کی اردو شاعری کی خصوصیات کو ایک کالم میں سمیٹنا ممکن نہیں، اس لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ لہٰذا ہم مختصر طور پر خاص خاص خوبیوں ہی کی طرف اشارہ کریں گے تاکہ کسی حد تک یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان کی اردو شاعری، پاکستان کی شاعری سے کیوں بہتر ہے اور عالمی ادب کی سطح پر اس کی الگ شناخت کیا ہے۔ ہم بحث کے دوران صرف شعر درج کریں گے، شاعروں کے نام نہیں بتائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعروں کے صرف نام ہی الگ الگ ہیں، باقی سب کچھ یعنی کلام اور انداز بیان وغیرہ ایک ہی جیسا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری غزلیں کسی ایک شاعر نے لکھ کر بہت سے شاعروں کے نام سے چھپوا دی ہیں۔ ممکن ہے یہ ''ایک شاعر'' خود شمس الرحمٰن فاروقی ہوں۔ انہوں نے بڑا زرخیز ذہن پایا ہے۔ ان کے لیے کچھ ممکن

نہیں کہ ۲۰۔۲۵ مختلف ناموں سے غزلیں لکھ دیں بہرحال اصل شاعر کوئی بھی ہو، ہم شاعری کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلی چیز جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر کو نئے نئے مضمون سوجھتے ہیں یا یوں کہیے کہ خاصی دور کی سوجھتی ہے۔ مثلاً

کپڑوں کی الماری کھولے کھڑا ہوں میں حیران
نہیں ہے میرے ناپ کا اس میں کوئی ایک لباس

کسی دوسرے کے کپڑوں کی الماری کھول کر حیران ہونا ایک بالکل نیا خیال ہے۔ اپنے کپڑوں کی الماری شاعر نے شاید اس لیے نہیں کھولی کہ اس میں سوائے خلعت سخن کے کچھ نہیں تھا لہٰذا رقیب کے کپڑوں کی الماری کھول لی۔

حیران ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کو چونکنے کا بھی شوق ہے۔ اس شوق کی خاطر فرماتے ہیں:

رستے میں کچھ تو ایسا ہو جس کو دیکھ کے چونک پڑیں
اور نہیں تو دو کاریں ہی آپس میں ٹکرا جائیں

جس راستے میں کاروں کے ٹکرانے کا منظر دیکھنے کی خواہش ہے، وہ راستہ کالج کی طرف جاتا ہے کیوں کہ جناب شاعر ابھی زیر تعلیم ہیں۔ ایک شعر میں انہوں نے اپنا تعلیمی نصاب بھی بتا دیا ہے:

مرے کالج میں ہر جانب ترا ہی نام لکھا ہے
تجھے ہی پڑھنے جاتا ہوں تجھے ہی پڑھ کے آتا ہوں

جو شاعر دوران تعلیم ایسے عمدہ شعر کہہ سکتا ہو، تعلیم کی تکمیل کے بعد تو معلوم نہیں وہ کیا قیامت ڈھائے گا لیکن قیامت ڈھانے سے پہلے بھی اسے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ مثلاً دو کام تو اس شعر میں بتائے ہیں:

نیش نو صوتیات میں رکھ دو
مغز جاں بھی دوات میں رکھ دو

ایک کام یہ بھی ہے:

چھت پر کبوتروں کے لیے صرف تھوڑی دیر
مشکل سہی یہ کام مگر کر لیا کریں

شاعر کو صرف کبوتروں سے نہیں، ہر طرح کے پرندوں سے دلچسپی ہے۔ یہاں تک کہ اسے باتوں اور مدارتوں کے پرندے بھی اڑتے دکھائی دیتے ہیں:

وہ تواضع بھری باتوں کے پرندے
ان لبوں پر مداراتوں کے پرندے

پرندوں کے علاوہ اسے ہر طرح کے جانوروں سے بھی بے حد لگاؤ ہے اور اس نے ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ خصوصاً کتوں، بلیوں اور خچروں پر تو ایسے ایسے شعر کہے ہیں کہ انہیں بلا تکلف میر کے بہتر نشتروں کا جواب سمجھنا چاہیے:

شہر کے سڑتے ہوئے ملبے میں
بلی کیا ڈھونڈ رہی ہے دیکھو

☆☆☆

گھورتا کیا ہے کمینے کتے
سونگھتا کیا ہے کمینے کتے

سوچنے کا کوئی علاج نہیں
سوچتا کیا ہے کمینے کتے

☆☆☆

نسب پر ہم نشینوں کے ہے اتراتا
شجاعت جنگ کا فخر معاذ اللہ

ہم تو سمجھتے تھے کہ پرندوں، چرندوں، درندوں اور گزندوں پر بہترین شاعری ساقی فاروقی نے کی ہے کیوں کہ خود اس کا شمار ادبی گزندوں میں ہوتا ہے لیکن اب معلوم ہوا، ساقی کو اس مقام تک پہنچنے میں خاصا وقت درکار ہوگا جہاں تک دبستان شب خون والوں کی رسائی ہے۔

غزل میں صرف اڑتے ہوئے پرندے اور بھاگتے ہوئے جانور ہی دکھائی نہیں دیتے، چلتی ہوئی جوتیاں اور کھڑی ہوئی بسیں بھی نظر آتی ہیں:

جرابیں اور جوتیاں تو اس کی
سفر کے سارے عذاب میرے

☆☆☆

سب تھکے ہارے لوگوں کو گھر چھوڑ کر
اپنے اڈوں پہ خالی بسیں رہ گئیں

دوسرا شعر علامتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ شعروں کو خالی بسیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ مسافران معانی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔

شب خونیوں نے غزل کا دامن اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس میں مشرق سے مغرب تک، جنوب سے شمال تک اور جنوری سے دسمبر تک کی ہر چیز سما گئی ہے:

تمام رنج و ملال اوڑھے
بدن نے سب ماہ و سال اوڑھے
میں مغربوں کے سفر میں مشرق
جنوب میں بھی شمال اوڑھے
لہو میں سلگا کے جون موسم
ملے دسمبر میں شال اوڑھے

ان شعروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شال میں لپیٹ کر بھی اچھے شعر کہے جا سکتے ہیں۔
اوڑھنے بچھونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شاعری میں ایسے فلسفیانہ مسائل پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے جن پر پوری پوری کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ صرف دو دو مصرعوں میں بات مکمل کر دی گئی ہے:

محفل میں رات گیت یہ تھا مجھ سے وصل کر
گویا مغنیہ کو کوئی کام ہی نہیں

☆☆☆

گناہ کھلتے ہیں میرے کس کس آنگن میں
یہ بھید مرنے سے پہلے مجھے بتانے ہیں

مگر شاعر یہ بھید نہیں بتائے، البتہ اس نے ایک اور اہم راز فاش کر دیا ہے:

گئے سال کی روشنی پی گیا
نئے سال کا یہ کیلنڈر سیاہ

غزل میں پینے پلانے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں، نئی بات یہ ہے کہ غیر مروف غزل میں قافیہ مصرعے کے آخر میں آتا ہے، لیکن مندرجہ بالا شعر میں شروع میں آیا ہے۔ ''گئے'' اور ''نئے'' سے دونوں مصرعوں کا آغاز صوتی اعتبار سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی شاعر غزل کی ہیئت میں نئے نئے تجربات کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر قافیہ مصرعوں کے درمیان لایا جائے۔
ہم نے اب تک جو شعر پیش کیے ہیں، وہ موضوعات اور لفظیات کے اعتبار سے جدید ترین ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ زبان کی شاعری نہیں کی جا رہی۔ کی جا رہی ہے اور نوح ناروی سے بہتر کی جا رہی ہے:

کہیں بھی تو کیا اس سے سب جان کر کے
اڑا دے گا ایران توران کر کے
سمجھ بوجھ کے خوب پہچان کر کے
وہ جب مجھ سے بولا تو انجان کر کے

اسی طرح سہل ممتنع کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً:

پس دیوار سایہ دھوپ ننگی
چلے آؤ میاں کوئی نہیں ہے

سہل ممتنع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر شعر کو نثر میں تبدیل کیا جائے تو لفظوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اس شعر کو نثر میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ پہلے ہی نثر میں ہے۔ معنوں میں تبدیلی کی بھی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ تبدیلی اسی چیز میں کی جا سکتی ہے جو موجود ہو۔
ہم نے اوپر جو شعر مثالاً درج کیے ہیں، ایسے ہی تقریباً دو سو شعر اور بھی ''شب خون'' کے پیش نظر شماروں میں موجود ہیں، لیکن ان شعروں کو نقل کرنے کے لیے جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے، اس کے فقدان کے سبب ہم نقل نویسی کی مزید خدمت انجام دینے سے معذور ہیں، لہٰذا پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ تھوڑے لکھے کو بہت جانیں اور یہ مان لیں کہ ہندوستان میں پاکستان سے بہتر شاعری ہو رہی ہے۔

# مشفق خواجہ کے چند خطوط

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مشفق خواجہ مرحوم سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات ۱۹۶۷ء کے اوائل میں کراچی میں ہوئی۔ وہ اس وقت انجمن ترقی اردو پاکستان میں مددگار معتمد تھے اور انجمن کے دفتر (واقع بابائے اردو روڈ) کی بالائی منزل میں بیٹھا کرتے تھے۔

سلسلہ مکاتبت کا آغاز اسی سال ہوا۔ راقم کے ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے انجمن کے جاری کردہ ''تمغائے بابائے اردو'' کی نوعیت واضح کی۔ راقم کے نام، ان کا یہی ۷/اگست ۱۹۶۷ء کا ٹائپ شدہ مراسلہ، پہلا خط ہے۔ راقم کے ذخیرہ خطوط میں ان کے اسی نوعیت کے مزید تین چار خطوط محفوظ ہیں۔ باقاعدہ خط کتابت ۱۹۷۹ء میں شروع ہوئی، جب میں نے انھیں ''کتابیات اقبال'' (لاہور، ۱۹۷۷ء) کا ایک نسخہ ہدیہ کیا۔ خطوں اور کتابوں کے تبادلے کا یہ سلسلہ جنوری ۲۰۰۵ء تک جاری رہا۔

راقم کے پاس خواجہ صاحب کے تقریباً سوا سو خطوط محفوظ ہیں۔ ذیل میں، ان میں سے چند خطوط، مختصر حواشی کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔ (ر۔ہ)

﴿۱﴾

برادرم عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔

آپ کے دونوں خط ملے اور اقبال سے متعلق مقالے کا عکس بھی۔ ان عنایات کے لیے ممنون ہوں۔ علامہ اقبال کی رائے کی ضرورت تھی (جلیل قدوائی کے بارے میں)۔ آپ کے مضمون سے کام چل جائے گا[۱]۔ اقبال کا متعلقہ شمارہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

''دائرے'' والوں کو آپ کا پتا دے دیا ہے اور کہا ہے کہ پچھلے چند شمارے آپ کو بھجوا دیے جائیں۔ رسالہ ''اردو'' کے شمارے آپ کو بھجوا دیے تھے، امید ہے ملے ہوں گے۔

اب کے میرا بہاول پور جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگرچہ وہاں کی سنٹرل لائبریری میں گذشتہ صدی کے بعض اخبارات (اودھ اخبار وغیرہ) سے استفادہ کرنا ہے۔ اب اگلے سال میں پروگرام بناؤں گا۔ ویسے مجھے بہاول پور بہت پسند آیا۔ کاش کوئی صورت ایسی ہوتی کہ میں اپنے کتب خانے سمیت وہاں ''آباد'' ہو سکتا۔ کراچی کی زندگی نہایت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ اپنے کتب خانے کی طرف سے سخت پریشان ہوں کہ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔

سویا مانے کا مقالہ بہت اچھا ہے۔ مواد کے اعتبار سے زبان و بیان کی غلطیاں دور ہو جائیں تو اس کا چھپنا بہت ضروری ہے۔ زاہد منیر عامر صاحب سے کہیے کہ وہ اس کام کو اردو کی خدمت سمجھ کر انجام دیں[۲]۔

آج کل میں یگانہ کے سلسلے میں قیام پاکستان سے پہلے کے ادبی جرائد دیکھ رہا ہوں۔ بہت بڑا ذخیرہ تو خود میرے کتب خانے میں ہے۔ اقبال کے بارے میں بہت سی چیزیں نظر آ رہی ہیں۔ ان پر نشان لگا کر رکھتا جا رہا ہوں کہ کبھی آپ کراچی تشریف لائیں تو انھیں دیکھیں گے۔

میرے پاس ایک کتاب ''تحفۂ امانیہ'' ہے جو نجف علی خاں اتالیق امیر امان اللہ خاں کی تصنیف ہے۔ یہ صاحب ایک زمانے میں کابل جیل میں نظر بند تھے۔ قید کے دوران انھوں نے مذکورہ عنوان سے ایک پند نامہ منظوم اپنے بیٹے کے لیے لکھا تھا جو کریمی پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے آخری سرورق پر علامہ اقبال کی یک سطری ''تقریظ'' ہے۔ یہ کتاب آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ بہر حال اس وقت یہ سامنے ہے تو اس کی تقریظ نقل کیے دیتا ہوں:

تقریظ

از ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ملک الشعراء مشرق — سطریں مطابق اصل

میں نے یہ نظمیں سرسری نظر سے دیکھ لیں۔ مصنف کا جوش عقیدت قابل داد ہے۔

اقبال

یہ عبارت سبز روشنائی میں چھپی ہے۔ امتدادِ زمانہ سے روشنائی اتنی مدھم ہوگئی ہے کہ عکس نہیں بن سکتا۔ کتاب پر سال طباعت درج نہیں ہے۔ البتہ سرورق نمبر ۲ پر انتساب کی عبارت کے نیچے مصنف کے نام کے ساتھ یہ تاریخ درج ہے۔ ماہ قوس ۱۳۰۲ش۔

شاید آپ کے علم میں ہو کہ لاہور کا مشہور کریمی پریس میرے نانا کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میرے ماموں ایک عرصے تک اسے چلاتے رہے۔ میں اس پریس کی طبع کردہ کتابیں جمع کرتا رہتا ہوں۔ مذکورہ کتاب اسی سلسلے میں میرے پاس ہے۔

''اقدار'' میں نہیں خریدتا۔ شروع کے ایک دو پرچے دیکھے تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ رشید حسن خاں کے مضمون کے لیے ایک دوست سے کہہ رکھا ہے جونہی مل گیا، پیش کر دوں گا۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا
مشفق خواجہ
۹۴۔۱۰۔۲۶

﴿۲﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون!

کراچی کے ہنگاموں کی وجہ سے آپ کا خط خاصی تاخیر سے ملا۔ آپ نے جواب مفصل دیا۔ بڑی زحمت اٹھائی۔ بے حد ممنون ہوں۔ آپ کا مضمون میرے ذہن میں نہیں تھا، عکس دیکھا تو یاد آیا کہ نظر سے گزر چکا ہے۔ غالب لائبریری سے میں جو مجموعہ شائع کر رہا ہوں، اس میں صرف وہی مضامین ہوں گے جو اردو میں لکھے گئے ہیں۔ تراجم شامل نہیں ہوں گے۔ اس مجموعے کا

ایک حصہ اقبال سے متعلق مضامین پر مشتمل ہوگا۔ اگر آپ اپنے مضمون پر نظر ثانی کر دیں تو اسے اس حصے میں بطور دیباچہ شامل کر لیا جائے۔ بعد میں آپ ''اقبالیاتِ ممتاز حسن'' کو وسیع پیمانے پر مرتب کر دیجیے۔ ڈاکٹر معز الدین کی کتاب بڑی حد تک ناقص ہے اور یہ موضوع آپ جیسے کسی صاحب نظر کا منتظر ہے[1]۔

مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ممتاز حسن مرحوم کے قدر دان ہیں۔ مجھے ان سے نیاز مندی کا تعلق تھا۔ بے حد شفیق اور مہربان بزرگ تھے۔ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جس زمانے میں وہ مولوی عبدالحق کے نام اقبال کے خطوط مرتب کر رہے تھے۔ اس زمانے میں خاصا وقت ان کے ساتھ گزرا تھا۔ کتاب کے دیباچے میں بھی انھوں نے میرا تذکرہ بڑی شفقت سے کیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا عظیم انسان نہیں دیکھا۔ ہر شخص کی مدد پر آمادہ رہتے تھے۔ ادیبوں کو تو انھوں نے اتنے فائدے پہنچائے اور ایسے ایسے طریقوں سے کہ آپ سنیں تو حیران ہوں۔ پاکستان کے کئی اہم علمی اداروں کے وہ بانی تھے۔ اور شاید ہی کوئی ادارہ ہو جس کی انھوں نے مدد نہ کی ہو۔ جب وہ برسر اقتدار تھے تو لوگ ان کی خوشامد کرتے تھے لیکن جب وہ ریٹائر ہو گئے تو لوگ ان سے یوں کنارہ کش ہو گئے جیسے ان کا وجود اور عدم وجود برابر ہو۔ مرحوم کو اس صورت حال کا شدید احساس تھا اور مرنے کے بعد تو انھیں بالکل ہی بھلا دیا گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ احمد دین والی کتاب[2] میں نے انھیں کے نام منسوب کی تھی اور حامد عزیز مدنی کا یہ شعر لکھا تھا:

وہ لوگ جن سے تری بزم میں تھے ہنگامے
گئے تو کیا تری بزمِ خیال سے بھی گئے

شان الحق حقی صاحب کو مرحوم سے دلی عقیدت ہے، انھیں کے اشتراک سے ممتاز صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ کچھ مضمون ان کے پاس تھے، کچھ میں نے جمع کیے ہیں۔ توقع ہے کہ اگلے سال کے شروع میں یہ مجموعہ چھپ جائے گا۔ کمپوزنگ شروع ہو گئی ہے۔ اس جمعہ کو ڈیڑھ سو صفحات کمپوز ہو کر آ جائیں گے۔ اس مجموعے میں آپ کے مضمون کی شمولیت سے مرحوم کی روح خوش ہوگی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس مضمون کو پڑھ کر بے حد خوش ہوتے۔

آپ نے مرحوم کے جن مضامین کی نشان دہی کی ہے، ان میں سے بعض میرے پاس ہیں۔ ڈاکٹر معز الدین کی کتاب میں شامل متون پر اعتبار نہیں۔ اصل مآخذ کو دیکھوں گا۔ اگر کوئی مشکل پیش آئی تو آپ کو زحمت دوں گا۔

مرحوم عبداللہ قریشی کے بارے میں کراچی میں تو کسی اخبار تک میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ ان کے بارے میں آپ یا اگر کوئی اور لکھ سکے تو ''قومی زبان'' کے صفحات حاضر ہیں۔ آپ نے جو انٹرویو لیا تھا، ایک تازہ تمہید کے ساتھ بھجوا دیجیے۔ تمہید میں ان کے مختصر حالات بھی دے دیجیے[3]۔

اکرام چغتائی صاحب سے رابطہ ہو گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسلام آباد میں وہ میرے چھوٹے بھائی کے پاس بیٹھے تھے، بھائی نے فون پر ان سے بات کرا دی۔

فروغ احمد صاحب سے انتقال کا بے حد افسوس ہوا[4]۔ آٹھ دس سال پہلے وہ کراچی میں علاج کے سلسلے میں آئے تھے تو ان سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ پاشا رحمان صاحب کے ہاں ان کا قیام تھا۔ چند روز ہوئے پاشا صاحب آئے تھے تو میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ فروغ صاحب پر ایک مضمون لکھ دیں۔ ایک تعارفی مضمون ''قومی زبان'' کے لیے آپ بھی کسی سے لکھوا دیجیے۔

مرحوم کا ایک طویل غیر مطبوعہ مقالہ غلام عباس پر میرے پاس ہے۔ یہ ''تخلیقی ادب'' کے غلام عباس نمبر کے لیے لکھوایا تھا۔ یہ نمبر ایک عرصے سے ''زیرِ طبع'' چلا آرہا ہے۔

تحسین فراقی صاحب کا کیا حال ہے؟ میں نے ان کے خسر کے انتقال پر تعزیت کا خط لکھا تھا۔ اس کے بعد ان سے کوئی رابطہ نہیں۔ زاہد منیر عامر کے نئے تقرر سے خوشی ہوئی۔ وہ صحیح جگہ پہنچ گئے۔ ''خدا بخش جرنل'' کے تازہ شمارے میں ان کا مضمون دیکھا۔ بہت اچھا مضمون ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر صاحب کا ایک عرصے سے کوئی خط نہیں آیا۔ ان سے کہیے کہ خط لکھیں۔ پچھلے دنوں سہیل عمر صاحب آئے تھے۔ ایک روز ان سے طویل ملاقات رہی۔

باقی سب خیریت ہے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۲-۱۱-۹۴

## ﴿۳﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۲؍اپریل ملا۔ پچھلا دوسطری خط آپ نے اس وقت لکھا تھا جب آپ لاہور سے باہر جارہے تھے۔ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ واپس آکر مفصل خط لکھوں گا۔ تازہ خط تو پچھلے خط سے بھی مختصر ہے۔ وہ مفصل خط آپ کب لکھیں گے؟ شاید ہندوستان سے واپس آکر کہ اس وقت لکھنے کے لیے آپ کے پاس لوازمہ بھی ہوگا۔ ہندوستان جانے کی اطلاع دل خوش کن ہے[۱]۔ ہمارا تہذیبی و ثقافتی ماضی وہیں ہے اور اس ماضی سے ہمیں گاہے گاہے تعلق رکھنا چاہیے۔ ہندوستان جانے کو میرا بھی دل بہت چاہتا ہے مگر خود ساختہ زنجیریں وسعتِ زنجیر سے باہر نکلنے نہیں دیتیں[۲]۔

آپ نے لکھا ہے کہ ''ارمغان'' ۳-۴ ماہ میں تیار ہوجائے گا۔ تحسین فراقی صاحب نے ایک دو ماہ کا مژدہ سنایا ہے۔ وہ شاید ارمغان کو بھی غزل سمجھتے ہیں جو ایک دو ماہ میں تیار ہوجائے گی۔ آپ کا موقف درست ہے، ارمغان کی تیاری میں کم از کم اتنا وقت ضرور صرف ہونا چاہیے، جتنا داستان امیر حمزہ کے لکھنے میں صرف ہوا تھا[۳]۔

میں نے آپ لوگوں ہی کی خاطر جھنڈیر کا پروگرام بنایا تھا، آپ ساتھ نہیں ہوں گے تو کیا مزہ۔ لہٰذا میں نے بھی وہاں جانے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ آیندہ کبھی ارادہ ہوا تو وہاں کسی سے محفل کے انعقاد کا انتظام کروں گا تا کہ آپ اور فراقی صاحب سرکاری حیثیت میں شرکت کرسکیں[۴]۔

رفاقت علی شاہد صاحب[۵] کے ہاتھ میں نے ''جاڑے کی چاندنی'' بھجوادی تھی۔ چند دیگر کتب و رسائل بھی بھیجے تھے۔ کیا یہ چیزیں آپ کو مل گئیں؟

لاہور میں ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا سدباب ہونا چاہیے۔ ان کے خلاف کئی گشتی

مراسلے میرے پاس آئے ہیں جن کا لب ولہجہ نہایت ناشایستہ ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ ہم اپنے بڑوں کی قدر نہیں کرتے تھے، اب یہ ہو رہا ہے کہ ہم انہیں ذلیل بھی کرتے ہیں[۵]۔

پچھلے دنوں اہلیہ کی طبیعت ناساز رہی۔ میری صحت بھی ڈانواں ڈول رہی۔ ایک زمانہ تھا کہ نیت ڈانواں ڈول رہتی تھی، اب یہ عالم صحت پر گزر رہا ہے۔ انقلابات ہیں زمانے کے! درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے۔

رشید حسن خاں صاحب کا ایک خط آپ کے نام آیا ہے، وہ بھیج رہا ہوں۔ احتیاطاً لفافہ رجسٹری سے بھیج رہا ہوں کہ اتنی دور سے آیا ہے خط ضائع نہ ہو جائے۔ لفافے میں دو اور خط بھی رکھ دیے ہیں۔ یہ از راہ کرم ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر اورنگ زیب تک پہنچا دیجیے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۱۰۔۴۔۹۷ء

﴿۴﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۲۴ مئی موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ''ارمغانِ وحید'' کا کام کچھ آگے بڑھا ہے مگر آپ دونوں تو اس سے بھی آگے بڑھ رہے ہیں کہ ہندوستان جا رہے ہیں۔ یہ سفر رفعت مبارک باد..... خدا کرے یہ سفر علمی اعتبار سے مفید ہو اور آپ خیریت کے ساتھ واپس آئیں۔ خیریت کے ساتھ ہی نہیں، بہت سی کتابوں کے ساتھ بھی۔ واپس آ کر مفصل خط لکھیے گا جو سفرنامے کی طرح طویل اور دلچسپ ہو۔ مگر آپ کا سفرنامہ تو شرعی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ہم جیسے آوارہ خوانوں کی خاطر اب کے دو چار اچھے چہرے بھی دیکھ لیجیے گا۔ اس کارِ خیر کا گناہ میرے سر رہے گا۔ آپ سے کوئی پرسش نہ ہوگی[۱]۔

کتاب کا نام ارمغانِ وحید ہی مناسب ہے۔ گوہر نوشاہی صاحب سے آپ مایوس ہو جائیے۔ ڈاکٹر صاحب کے مختصر کوائف اور کتابیات کی شمولیت کافی رہے گی۔ میں گوہر صاحب کو خط لکھ رہا ہوں کہ اب وہ زحمت نہ فرمائیں۔ اور اپنا مضمون اس وقت مکمل کریں جب ڈاکٹر وحید قریشی دوبارہ مقتدرہ کے صدر نشین ہوں[۲]۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی اس مجموعے میں شمولیت بہت ضروری ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان سے ایک مختصر مضمون حاصل کر لیا جائے؟ اس کی مجلس مشاورت و ادارت کے صدر احمد ندیم قاسمی ہیں، کیا ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک دو صفحات ان سے نہ لکھوا لیے جائیں؟ اگر آپ ان تجاویز سے متفق ہوں تو ان دونوں حضرات کو میں خط لکھ سکتا ہوں۔ مجموعی طور پر ان دونوں کے مضامین ۱۵۔۲۰ صفحات میں آ جائیں گے اور اس طرح دو بڑے ناموں کی شمولیت بھی ہو جائے گی[۳]۔

مضامین کی فہرست سے اندازہ ہوا کہ اچھا خاصا مجموعہ بن گیا ہے۔

دہلی میں اگر کوئی پرسانِ حال ملے تو میرا اسلام کہیے گا۔ دو بزرگوں تک اگر آپ بطور خاص سلام پہنچا سکیں تو کرم ہوگا۔

ایک تو ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور دوسرے شاہد علی خان صاحب (مکتبۂ جامعہ)

شدید گرمی اور بجلی کے غائب ہونے کے باوجود اپنے کاموں میں حسب معمول مصروف ہوں اور کالم نہ لکھنے کی وجہ سے ذہنی سکون بھی میسر ہے۔

ایک خط عبدالغنی فاروق صاحب کے نام بھی لکھ رہا ہوں۔ ازرہ کرم ان تک پہنچا دیجیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۲۸۔۵۔۹۷ء

﴿۵﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے خطوط لکھنے کا سلسلہ جو دہلی میں شروع کیا تھا، وہ آج تک قائم ہے۔ آج کی ڈاک سے اخباری تراشوں کے فوٹو اسٹیٹ ملے ہیں۔ دلی کا سفرنامہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے مگر جب آپ اسے اشاعت کے لیے لکھیں گے تو اس کی افادیت اور دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔ معذرت خواہ ہوں کہ میں اب تک آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ ادھر کچھ دنوں سے میری اور آمنہ کی طبیعت خراب رہی۔ شدید گرمی، بجلی کا غائب رہنا اور اس پر طبیعت کی خرابی، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس عذاب سے گزرا ہوں گا۔ میں تو اب خدا کے فضل سے ٹھیک ہوں، البتہ آمنہ بلڈ پریشر کی وجہ سے مضمحل رہتی ہیں۔ علاج ہو رہا ہے۔

دہلی میں آپ کی جو پذیرائی ہوئی، اس سے بے حد خوشی ہوئی اور سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی ہے کہ آج موصول ہونے والے تراشوں میں ایک ایسی تصویر بھی ہے جس میں ایک کنارے پر آپ ہیں اور دوسرے کنارے پر ایک خوبصورت چہرہ۔ بیچ میں جو دو آدمی کھڑے ہیں وہ کباب میں ہڈی نظر آتے ہیں۔ آپ کے چہرے پر جو بشاشت نظر آ رہی ہے، وہ دوسرے کنارے ہی کا فیضان معلوم ہوتا ہے۔ اچھا ہے تحسین فراقی اس تصویر میں نہیں ہیں، ورنہ وہ آپ کو محظوظ ہونے کا موقع نہ دیتے اور کسی عاشقانہ بلکہ فاسقانہ غزل کہنے کے لیے مسلسل اسی طرف دیکھتے رہتے اور اس طرح آپ کے راستے کی دیوار بن جاتے۔

آپ نے بڑا کرم فرمایا کہ خواجہ غلام السیدین کے نام خطوط کا مجموعہ (بزم یاراں) شاہد علی خاں صاحب سے حاصل کر لیا۔ میں انھیں شکریے کا خط لکھ رہا ہوں۔ مگر جناب، ان خطوط کا ایک نہیں، دو مجموعے چھپے ہیں اور ان کے نام میں نے آپ کو فون پر لکھوائے تھے۔ دوسرے مجموعے کا نام ''اگلی صحبتیں'' ہے۔ اب یہ کسی دوسرے ذریعے سے منگواؤں گا۔ ایم حبیب خان صاحب کے پاس بہت سی کتابیں رکھی ہیں، میں نے انھیں لکھا تھا کہ ان میں سے دو چار آپ کے اور تحسین صاحب کے حوالے کر دیں مگر افسوس کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ آپ کے ذریعے جو لفافہ بھیجا ہے، اس میں ایک کتابچے کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور یہ لکھا ہے کہ آپ کی کتابیں ڈاک سے بھیج دوں گا۔ یہ بات وہ کئی برسوں سے لکھ رہے ہیں حالانکہ ڈاک کے اخراجات میں انھیں پیشگی ادا کر چکا ہوں۔

آپ کو ایرپورٹ پر کتابوں کی مد میں گیارہ سو روپے دینے پڑے۔ میرے خیال میں یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ یقیناً

آپ ایسی کتابیں لائے ہوں گے جو عام حالات میں دستیاب نہیں ہوسکتیں۔ نومبر میں لاہور آنے کا ارادہ ہے۔ ان شاء اللہ اس وقت ان کتابوں کو دیکھوں گا۔ ویسے ہندوستان سے میرے پاس کثرت سے کتابیں آتی ہیں۔ اوسطاً مہینے میں دس سے پندرہ تک۔ پچھلے چند ماہ میں صرف خدا بخش لائبریری نے ۶۴ کتابیں بھیجی ہیں۔ یہ سب بلا طلب ہوتی ہیں۔ شاہد علی خاں صاحب کے پاس میری کتابوں کی رائلٹی کی مد میں اچھی خاصی رقم جمع ہے۔ ان سے کتابیں منگواتا ہوں اپنے حساب میں۔ مگر وہ اتنے مصروف ہیں کہ دس کتابوں کے لیے لکھوں تو ایک دو سے زیادہ نہیں بھیجتے۔

آپ نے پروفیسر اسلم صاحب کی کتاب میں شامل کتبوں کا مہندیوں کے قبرستان کے کتبوں سے مقابلہ کر کے معلوم کیا کہ اکثر کتبے غلط نقل ہوئے ہیں۔ میں نے مقابلہ کیے بغیر کتاب میں شامل بیشتر کتبوں کی اغلاط سے اسلم صاحب کو مطلع کیا تھا۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ کتبے انھوں نے رواروی میں نقل کیے۔ دوسرے بعض کتبوں میں خطاطوں نے آرائشی خطاطی کی ہے اور بعض الفاظ سطروں کے اوپر لکھ دیے ہیں۔ اسلم صاحب نے ان الفاظ کو صحیح مقام پر نقل نہیں کیا۔ کتبوں میں شامل شعر بھی بیشتر غلط نقل ہوئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلم صاحب موزوں طبع نہیں ہیں۔ میں نے یہ سب باتیں انھیں لکھی تھی اور انھوں نے ان اغلاط کو تسلیم کیا تھا، مگر ان باتوں کے باوجود، ان کا سفر نامہ بے حد دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ دوسروں کا مجھے علم نہیں، لیکن میری معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ کتاب کی دلچسپی کا یہ حال ہے کہ جب تک میں نے اسے ختم نہیں کر لیا، دوسرا کوئی کام نہیں کیا۔ پروفیسر اسلم صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، صاحب علم ہیں، مگر دو باتیں نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔ ایک تو تلفظ کی غلطیاں بہت کرتے ہیں، دوسرے شعر صحیح لکھتے ہیں، نہ پڑھتے ہیں۔ محقق کے لیے موزوں طبع ہونا بہت ضروری ہے۔

پروفیسر اسلم کے ذکر پر یاد آیا کہ جس روز ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اقبال اکیڈمی چھوڑی ہے اسی دن میں نے پروفیسر اسلم صاحب کو خط لکھا کہ اب وہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی قریشی صاحب کو واپس کر دیں۔ میرا خط ملتے ہی اسلم صاحب قریشی صاحب کے گھر گئے اور اپنا استعفا پیش کر دیا۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ قریشی صاحب کے لیے بیکار بیٹھے رہنا مناسب نہیں۔ کوئی نہ کوئی مشغولیت ہونی چاہیے۔ پروفیسر اسلم صاحب بھی اب علی گڑھ سکول سے متعلق ہونے کے بعد خاصے مصروف ہو گئے ہیں۔ اور میں نے سنا ہے کہ انھیں وہاں سے پندرہ ہزار روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ وہ وہاں خوش ہیں۔ اکیڈمی کی وجہ سے قریشی صاحب کے اور اسلم صاحب کے باہمی تعلقات خوشگوار نہیں رہے تھے۔ اب ان شاء اللہ یہ صورت حال نہیں رہے گی اور دونوں میں پہلے کی طرح دوستانہ مراسم قائم ہو جائیں گے۔

قریشی صاحب کے ذکر پر یاد آیا کہ ''ارمغانِ علمی'' کس منزل میں ہے۔ اس کے نام کے سلسلے میں عرض ہے کہ ''ارمغان وحید'' درست نام نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے ''تحفہ منجانب وحید'' جبکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ لہٰذا ''ارمغان علمی'' ہی نام مناسب رہے گا۔ پروفیسر شفیع مرحوم کو بھی اسی نام سے ارمغان پیش کیا گیا تھا۔ نام ''علمی ارمغان'' بھی ہوسکتا ہے۔

ابھی ابھی تحسین صاحب کا خط بھی ملا ہے۔ انھیں بھی جواب لکھوں گا۔ خدا کرے سب خیریت سے ہوں۔

آپ کا

مشفق خواجہ

۸-۷-۹۷ء

# ﴿ ۶ ﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

گرامی نامہ مورخہ ۷ اجولائی موصول ہوا۔ اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ اس سے پہلے دو خط آپ کے نام لکھ چکا ہوں۔ امید ہے اب تک یہ اورنگ زیب صاحب نے آپ کے حوالے کر دیے ہوں گے۔ پی ایچ ڈی کے لیے ایک دو نہیں، ہزاروں موضوعات ہیں۔ مگر اب ایسے طالب علم کہاں جو محنت سے کام کر سکیں اور کام کرنے کی اہلیت و صلاحیت رکھتے ہوں۔ جس شخص نے زندگی میں پانچ صفحات کا ایک مضمون بھی نہ لکھا ہو، وہ ایک دم پانچ سو صفحات کا مقالہ لکھ دیتا ہے۔ میری رائے میں تو آپ جب تک کسی طالب علم کو خوب ٹھونک بجا کر نہ دیکھ لیں، پی ایچ ڈی میں داخلہ نہ دیں۔ جلیل قدوائی اور رفیق خاور جیسے ادیب ایم اے کے مقالے کے لیے تو موزوں ہو سکتے ہیں مگر پی ایچ ڈی کی سطح پر ان پر کام نہیں ہو سکتا۔ اگر افراد ہی پر یہ کام کرنا ہے تو پھر مندرجہ ذیل پر توجہ فرمایئے۔ آپ نے چونکہ دواوین کی تدوین کو خارج از آہنگ قرار دیا ہے، اس لیے صرف نثر نگاروں کے نام لکھتا ہوں:

| | |
|---|---|
| ۱۔ مالک رام | ۲۔ اثر لکھنوی (بطور نقاد) |
| ۳۔ ممتاز حسین | ۴۔ ابراہیم جلیس |
| ۵۔ اختر حسین رائے پوری | ۶۔ اشرف صبوحی |
| ۷۔ شیخ محمد اکرام | ۸۔ امداد امام اثر |
| ۹۔ میر باقر علی داستان گو | ۱۰۔ چراغ حسن حسرت |
| ۱۱۔ عبدالمجید سالک | ۱۲۔ ڈاکٹر تاثیر |
| ۱۳۔ مولوی عبدالحق | ۱۴۔ شوکت سبزواری |
| ۱۵۔ خواجہ احمد فاروقی | ۱۶۔ خواجہ حسن نظامی |
| ۱۷۔ مجنوں گورکھپوری | ۱۸۔ کنہیا لال کپور |
| ۱۹۔ قاضی عبدالودود | ۲۰۔ امتیاز علی عرشی |
| ۲۱۔ وقار عظیم | ۲۲۔ ظفر علی خاں (بطور نثر نگار) |
| ۲۳۔ ممتاز شیریں | ۲۴۔ جوش (بہ حیثیت نثر نگار) |
| ۲۵۔ محمد حسن عسکری | ۲۶۔ خواجہ ناصر نذیر فراق |

ایک اہم کام یہ ہو سکتا ہے کہ اردو کے بڑے نثر نگاروں کی فرہنگیں تیار کرائی جائیں، مثلاً سرسید، محمد حسین آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا حالی، عبدالحلیم شرر جیسے مصنفین کی فرہنگیں تیار ہوں۔ (مع امثال) تو اردو کے بہت سے خوابیدہ الفاظ سامنے آ جائیں گے۔

اب میں کچھ دوسرے موضوعات تجویز کرتا ہوں جن پر کام کی بے حد ضرورت ہے:

| | |
|---|---|
| ۱۔ اردو میں لغت نگاری | ۲۔ اردو میں قواعد نویسی |

۳۔اردو میں تحقیق
۴۔اردو ادب، عہد محمد شاہی میں
۵۔عہد میر کے اردو شعرا
۶۔اردو کا ایک اہم ادبی مرکز: مرشد آباد
۷۔پنجاب میں اردو نثر نگاری (قیام پاکستان سے قبل)
۸۔بیسویں صدی کے ادبی رسائل (قیام پاکستان سے قبل)
۹۔دلی کا دبستان نثر
۱۰۔برصغیر کے علمی و ادبی ادارے (قیام پاکستان سے قبل)
۱۱۔اردو کے رومانی نثر نگار
۱۲۔اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے مشترکہ عناصر
۱۳۔اردو ادب کی تاریخیں
۱۴۔اردو میں قرآن شریف کے تراجم
۱۵۔اردو میں قرآن شریف کی تفسیریں
۱۶۔اردو پر فارسی زبان و ادب کے اثرات

کلاسیکی شاعروں پر اور ان کے دواوین کی تدوین کا کام بھی ہونا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں ایسے اساتذہ بہت کم ہیں جو پی ایچ ڈی کا کام کرانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ آپ جیسے دو چار استادوں کو چھوڑ کر مجھے تو دور دور تک کوئی ایسا استاد نظر نہیں آتا جو ادب کا صحیح ذوق رکھتا ہو اور ادب کے بارے میں اس کی معلومات وسیع ہوں۔

نومبر کے آخر میں میرے بھتیجے کی شادی ہے اور دسمبر میں ڈاکٹر وحید قریشی کی صاحب زادی کی۔ کوشش کروں گا کہ ان دونوں شادیوں کا درمیانی وقفہ لاہور میں گزاروں کہ بیوی کے ساتھ دو مرتبہ ہوائی سفر کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس دوران میں ان شاء اللہ آپ سے ملاقاتیں رہیں گی۔ میرے پچھلے دونوں خطوں کا جواب جلد عنایت فرمایئے۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۸۔۷۔۹۷ء

﴿۷﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون
۲۱ راگست کا خط ابھی ابھی ملا۔ شکریہ

۱) ممتاز حسن مرحوم کا پتا C-12, K.D.A Scheme No.1 درست ہے۔ C-129 بھی درست ہے۔ ایک مکان میں ان کی رہایش تھی اور دوسرے میں اس اشاعتی ادارے کا دفتر تھا جس کے وہ سربراہ تھے۔ یہ وہی ادارہ ہے جس کی طرف سے کئی فارسی شعرا کے مخطوطوں کے عکس شائع کیے گئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ممتاز صاحب نے PECHS سوسائٹی میں مکان بنوایا تھا اور اسی میں رہتے تھے۔

۲) MCNEIL درست ہے نہ MC NEIL۔ صحیح لفظ McNEIL ہے۔ یعنی M کے بعد Capital C نہیں ہوگا۔ اس قسم کے نام اسی طرح لکھے جاتے ہیں، جیسے McMOHAN, McLEOD وغیرہ۔ Dictionary of Indian Biography دیکھ لیجیے۔

۳) حواشی کے نشانات اڑا دیجیے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ ڈاکٹر مختار الدین صاحب سے حواشی لکھنے کے لیے کہا جائے۔

۴) ڈاکٹر وحید قریشی کے کوائف کتاب کے شروع میں ہوں تو اچھا ہے۔ ویسے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیباچے میں ان کا ذکر کر دیا جائے اور انھیں کتاب کے آخر میں رکھا جائے[1]۔

اجی حضرت! آپ بھی غضب فرماتے ہیں۔ آپ کے خط کے جواب میں خاصا وقت صرف کر کے پی ایچ ڈی کے موضوعات کی فہرست بھیجی مگر آپ نے رسید تک نہیں دی۔ ''ترجمان القرآن'' کے سلسلے میں دو خط لکھے۔ رسالے مل گئے اور ساتھ ہی دفتر ''ترجمان القرآن'' سے سالانہ چندے کی طلبی کا خط آ گیا۔ میں نے وی پی پی وصول کرنے کا جو لفافہ بھیجا تھا، اس پر کیا کارروائی ہوئی![2]

موعودہ مفصل خط اگر آپ اسی سال لکھ سکیں تو کرم ہوگا۔

خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۵۔۸۔۹۷ء

﴿۸﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔

آپ کا ۱۷ اکتوبر کا خط مل گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اب بہت بہتر ہوں اور اپنے کاموں کی طرف توجہ کر رہا ہوں۔ گو معمول کے مطابق ۱۲ سے ۱۶ گھنٹے کی نشست نہیں رہتی۔ وقفے وقفے سے آرام بھی کر لیتا ہوں۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی ستمبر کے پہلے ہفتے میں کراچی آئے تھے۔ اپنے مضمون کی ایک نقل انھوں نے مجھے دی تھی۔ میں نے اسی وقت اسے پڑھ لیا تھا۔ میرے خیال میں یہ مضمون اسی صورت میں شامل کر لیجیے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں (خصوصاً خاندان کے حوالے سے) جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں[1]۔

رفاقت علی شاہد کے حواشی مفید ہیں[2]۔ مگر مقالے کے ساتھ ان کی اشاعت مناسب نہ ہوگی۔ اور پھر اگر مقالے کی غلطیوں کی تصحیح کرنی تھی تو مکمل معلومات دی جاتیں۔ رفاقت صاحب نے اس کا اہتمام نہیں کیا، مثلاً ممنون سے متعلق منشاء الرحمٰن منشا کے کام کا ذکر ضرور ہونا چاہیے تھا۔ ''گلزار ابراہیم'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ علی لطف نے اس کا ترجمہ کیا ہے جب کہ صحیح صورت یہ ہے کہ لطف نے ''گلشن ہند'' میں صرف منتخب شعرا کے تراجم ترجمہ کیے ہیں، پورے تذکرے کا ترجمہ نہیں کیا۔ کلیات جعفر علی حسرت کے بارے میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں اس کی اشاعت کی خبر ہے جبکہ اس کی اشاعت کو ایک مدت گزر چکی ہے۔ پھر ایسے جملے بھی نظر آتے ہیں: ''کہیں نظر سے گزرا تھا.....'' اس قسم کی باتوں کی موجودگی میں رفاقت صاحب کے حواشی پر بھی لوگ اعتراض کریں گے۔ رفاقت صاحب کی محنت قابل داد ہے لیکن یہ حواشی کہیں اور چھپیں تو بہتر ہے۔

''ارمغان علمی'' اور ''ارمغان وحید'' میں سے پہلا نام مناسب ہے۔ دوسرے نام کے یہ معنی بھی نکلتے ہیں ''ارمغان منجانب وحید''۔ اس قسم کا اعتراض ''ارمغان نارنگ'' پر کیا گیا تھا کہ اس سے ''ارمغان برائے نارنگ'' کے معنی نہیں نکلتے۔

آپ کے بلجیم جانے کی اطلاع سے خوشی ہوئی اور اس کا افسوس کہ عین اسی زمانے میں میں لاہور میں ہوں گا۔ سہیل عمر

صاحب نے بتایا ہے کہ آپ ۲۷ر نومبر کو واپس آ جائیں گے۔ کوشش کروں گا کہ میں ۳۰ر تک لاہور میں رہوں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ اکرام چغتائی کی قیادت میں لندن بھی جائیں گے۔ فسق و فجور کے کاموں میں اگر اکرام چغتائی سے بہتر رہنما نہیں مل سکتا۔

ڈاکٹر گیان چند کل (۲۳ر اکتوبر) شام کو لاہور کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے شائق ہیں۔ آج میں نے سہیل عمر صاحب کو فون پر کہا کہ وہ ان سے آپ کی ملاقات کا انتظام کر دیں۔ توقع ہے کہ میرے خط کے پہنچنے تک آپ ان سے مل چکے ہوں گے۔ انھیں اورینٹل کالج بھی لے جایئے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ
۲۲۔۱۰۔۹۷ء

﴿۹﴾

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون

آپ کے دونوں خط مل گئے۔ شکر گزار ہوں، آپ نے اپنے والد بزرگوار مرحوم و مغفور کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے اسے پڑھ کر آپ کے لیے اور مرحوم کے لیے دل سے دعا نکلی۔ آپ نے مجھے ایک پیکر عمل سے متعارف کرایا اور مرحوم نے کام کرنے والوں کے لیے ایک روشن مثال چھوڑی۔ دراصل کسی تحریک کی کامیابی کی بنیاد مخلص کارکن ہی ہوتے ہیں جو کسی صلے اور نام و نمود کی خواہش کے بغیر، اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ آسودہ حال لوگ دراصل اس قسم کے کام کر ہی نہیں سکتے کہ آسودگی کی خواہش راستے کا پتھر بن جاتی ہے۔ آپ کے دادا جان کا کردار بھی مثالی تھا۔ وہ اگر اپنے بیٹوں کو تحصیل علم کے لیے مشکلات اٹھانے کا راستہ نہ دکھاتے تو ان کے بیٹے اور پوتے آج بھی کاشتکار ہوتے اور اس خاندان میں کوئی رفیع الدین ہاشمی پیدا نہ ہوتا۔ آپ کے والد مرحوم کو ان کی نیکیوں کا اجر تو اگلے جہان میں مل رہا ہوگا، لیکن ایک انعام اسی دنیا میں مل گیا، اور وہ انعام آپ ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مرحوم کی مفصل سوانح عمری لکھیں کہ یہ نئی نسل کے لیے بہت کچھ سیکھنے کا ذریعہ ہوگا۔ سوانح عمری صرف ان لوگوں کی نہیں لکھی جاتی جو اصطلاحی معنوں میں بڑے ہوں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جو اپنے پیچھے بقول مخدوم کام چھوڑتے ہیں، نام نہیں چھوڑتے۔ لہٰذا ان کی سوانح عمری بھی لکھی جانی چاہیے۔

خدا کرے اب تک عارف نوشاہی کا ارسال کردہ 'ارمغان' کا لوازمہ آپ کو مل چکا ہو اور کتاب پریس چلی گئی ہو۔ دیباچہ میں نے دیکھ لیا، بہت عمدہ ہے۔ البتہ ایک بات درست نہیں کہ میرا نام محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع کے ساتھ اساتذہ تحقیق میں شامل کیا گیا ہے۔ میں ان اساتذہ کی خاک پا بھی نہیں۔ اور ان کے ساتھ میرا نام لینا ایک ادبی کفر ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب مجھ سے محبت فرماتے ہیں، یہ میرے لیے باعث فخر ہے مگر میرا نام اس طرح چھپے گا تو اس سے اہل نظر خوش گوار اثر نہیں لیں گے۔ میری گزارش ہے کہ آپ اس دیباچے میں سے میرا نام حذف کر دیں۔ قاسمی صاحب سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بعد

میں اگر وہ پوچھیں گے تو میں جواب دہ ہوں گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ امید ہے آپ توجہ فرمائیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا مجھے ناقابل تلافی رنج ہوگا۔ ہاشمی صاحب، ہر آدمی اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے، مگر میں مزاجاً اس سے رنجیدہ ہوتا ہوں کیونکہ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ آپ یقین کیجیے کہ قاسمی صاحب کے دیباچے میں اپنا نام اس انداز سے دیکھ کر مجھے خوشی نہیں ہوئی کیونکہ میں ہرگز ہرگز ان الفاظ کا مصداق نہیں ہوں[۲]۔

آپ نے اپنے کتب خانے کے بارے میں گنجایش کی جو بات لکھی ہے بالکل درست ہے۔ میں نے تو لائبریری کے لیے دس کمرے مخصوص کیے تھے اور اب وہ بھی کم پڑ گئے ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ اپنے پاس صرف وہ کتابیں رکھیں جن کا رکھنا بے حد ضروری ہو۔ باقی تمام کتابیں فروخت کر دیجیے۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

۲۵-۹-۹۸ء

# حواشی

**خط نمبر ۱:**

۱۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اردو لیکچرر کے امیدواروں کے کاغذات، رائے کے لیے علامہ اقبال کو بھجوائے تھے۔ امیدواروں میں جلیل قدوائی بھی شامل تھے۔ اقبال کی رائے بڑی حد تک ان کے حق میں تھی۔ راقم نے اپنے ایک مضمون (''اقبال کے پانچ غیر مدون خطوط'' مطبوعہ ''صحیفہ'' لاہور، اقبال نمبر نومبر ۱۹۷۷ء) میں اقبال کا مذکورہ خط شامل کیا تھا، یہاں اسی مضمون کا ذکر ہے۔

۲۔ سویامانے یاسر (حال ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، اوساکا یونی برائے مطالعات غیر ملکی) نے ایم اے اردو کا یہ مقالہ بہ عنوان ''غلام عباس: سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ'' شائع کر دیا تھا (سنگ میل لاہور، ۱۹۹۶ء)

۳۔ مجھے ''اقدار'' کراچی میں شائع شدہ مضمون ''کلام اقبال کی تدوین'' (رشید حسن خاں) کی تلاش تھی۔ بعد ازاں یہ مضمون ''سیارہ'' لاہور (ستمبر ۱۹۹۹ء) میں شائع ہوا۔ اب یہ رشید حسن خاں کی ''تدوین، تحقیق، روایت (دہلی ۱۹۹۹ء) اور راقم کی ''اقبالیات: تفہیم و تجزیہ'' (لاہور ۲۰۰۴ء) میں بھی شامل ہے۔

**خط نمبر ۲:**

۱۔ یہ ذکر ہے ''مقالات ممتاز حسن'' (مرتبہ: شان الحق حقی۔ ادارہ یادگار غالب کراچی، ۱۹۹۵ء) کا...... راقم نے ''علامہ اقبال اور ممتاز حسن'' کے عنوان سے ''قومی زبان'' (اپریل ۱۹۷۵ء) میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے ایما پر یہ مضمون نظر ثانی کے بعد، متذکرہ بالا مجموعے کے حصۂ اقبالیات میں ''پیش لفظ: ممتاز حسن، ایک ممتاز اقبال شناس'' کے عنوان سے شامل کیا گیا۔

۲۔ خواجہ صاحب نے مولوی احمد دین کی کتاب ''اقبال'' (۱۹۲۶ء) کا نیا ایڈیشن حواشی و تعلیقات کے ساتھ میں نے انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی شائع کیا تھا۔

۳۔ راقم نے ''سیارہ'' مئی جون ۱۹۸۸ء میں محمد عبداللہ قریشی (م: ۱۲ر اگست ۱۹۹۴ء) سے ایک مصاحبہ (انٹرویو) شائع کیا تھا۔

۴۔ پروفیسر فروغ احمد (م: ۲ر نومبر ۱۹۹۴ء) شاعر، ادیب، قائد اعظم کالج ڈھاکا میں اردو کے استاد۔ تفصیل دیکھیے: ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ: ''پروفیسر فروغ احمد، حیات اور خدمات'' از ناظمہ اعجاز، ۱۹۹۰ء۔ مخزونہ اورینٹل کالج لائبریری لاہور

## خط نمبر ۳:

١۔ راقم کو پروفیسر تحسین فراقی اور پروفیسر محمد ایوب صابر کی رفاقت میں جون ۱۹۹۷ء میں بھارت کا سفر درپیش ہوا تھا، بہ سلسلہ علامہ اقبال سیمی نار، بہ اہتمام شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی۔ تفصیل دیکھیے: ''دہلی میں اقبال سیمی نار'' (رسالہ ''اقبالیات'' لاہور، جولائی ۱۹۹۷ء)

٢۔ اس سے پہلے خواجہ صاحب ۱۹۸۵ء میں بھارت جا چکے تھے۔

٣۔ مراد ہے ''ارمغان علمی، بپاس خدمات علمی و ادبی ڈاکٹر وحید قریشی'' جسے عارف نوشاہی، تحسین فراقی اور راقم نے مرتب کیا تھا۔ (الفتح انٹر پرائزز لاہور، ۱۹۹۸ء)

٤۔ جھنڈیر لائبریری (میلسی) جانے کا پروگرام بالآخر اپریل ۲۰۰۱ء میں روبہ عمل آ سکا۔ خواجہ صاحب کراچی سے اور تحسین فراقی اور اورنگ زیب عالمگیر لاہور سے جھنڈیر پہنچ گئے مگر افسوس کہ راقم وہاں نہ جا سکا اور خواجہ صاحب کی چند روزہ صحبت سے محروم رہا۔

٥۔ رفاقت علی شاہد (پ: ۱۹۶۶ء) متعدد کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ انیسویں صدی میں اردو گل دستے کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ زیر تصنیف ہے۔

٦۔ یہ ذکر ہے ان گمنام مراسلوں کا جن کے ذریعے ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی کردار کشی کی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ آئندہ میقات کے لیے وہ اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر مقرر نہ ہو سکیں۔ مہم چلانے والے (؟) اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

## خط نمبر ۴:

١۔ افسوس ہے میں بھارت کا سفر نامہ نہ لکھ سکا۔ فقط پہلی قسط ''سرزمین دلی کی'' کے عنوان سے ''علامت'' لاہور (اکتوبر ۱۹۹۸ء) میں شائع ہوئی۔

٢۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا مضمون، بعد ازاں مکمل ہو کر ''ارمغان علمی'' میں شامل ہوا۔

٣۔ متذکرہ مجموعے میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا مضمون ''حقیقت اور فکشن'' شامل ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی نے کتاب کی ''تقدیم'' تحریر کی تھی۔

٤۔ پروفیسر محمد اسلم (م: ۶/اکتوبر) کے ''سفر نامہ ہند'' (لاہور ۱۹۹۵ء) کا ذکر ہے۔ راقم بھارت کے سفر (جون ۱۹۹۷ء) میں یہ کتاب ساتھ لے گیا تھا، اس کے ذریعے دہلی کے آثار دیکھنے میں خاصی سہولت رہی۔

## خط نمبر ۵:

١۔ دہلی کے چودہ روزہ سفر میں، تین روز تو اقبال سیمی نار میں مصروفیت رہی۔ پھر استقبالیوں اور دعوتوں کا سلسلہ چلا۔ استقبالیہ جلسے اور نشستیں انجمن ترقی اردو، اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، مرکز جماعت اسلامی ہند اور غالب اکیڈمی اور مکتبہ جامعہ میں منعقد ہوئیں اور سید مظفر حسین برنی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر عبدالحق اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے طعام کے لیے مدعو کیا۔

٢۔ پروفیسر محمد اسلم (م: ۶/اکتوبر ۱۹۹۸ء) کے ''سفر نامہ ہند'' (لاہور ۱۹۹۵ء) کا ذکر ہے۔ راقم بھارت کے سفر (جون ۱۹۹۷ء) میں یہ کتاب ساتھ لے گیا تھا، اس کے ذریعے دہلی کے آثار دیکھنے میں خاصی سہولت رہی۔

## خط نمبر ۶:

١۔ یہ خواجہ صاحب کی رائے تھی۔ شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی سے ان دونوں شخصیات پر پی ایچ ڈی سطح کا کام ہو چکا ہے۔

## خط نمبر ۷:

١۔ یہ چاروں استفسارات متذکرہ بالا ''ارمغان علمی'' میں شامل مضمون ''ممتاز حسن کے خطوط، دوارکا داس شعلہ کے نام (مختار الدین احمد)'' کے ضمن میں کیے گئے تھے۔

٢۔ خواجہ صاحب، علمی و ادبی رسائل و جرائد بالعموم چندہ ادا کر کے منگاتے تھے۔ ''ترجمان القرآن'' کے بھی باقاعدہ خریدار تھے۔ وی پی

وصول کرنے کے باوجود دفتر ترجمان کی غفلت سے انھیں سالانہ چندے کی طلبی کا خط آ گیا تھا۔

## خط نمبر ۸:

۱ اس مضمون کا ذکر خط ۴ کے حاشیہ ۲ میں آ چکا ہے۔

۲ رفاقت علی شاہد نے یہ حواشی، ''ارمغان علمی'' میں شامل مضمون ''کلکتہ اور اطراف کلکتہ کے کتب خانوں میں محفوظ اردو مخطوطات'' (شانتی رنجن بھٹا چاریہ) پر لکھے تھے۔

۳ بلجیم کا یہ سفر ایک اقبال سیمی نار کے سلسلے میں تحسین فراقی، سہیل عمر، اکرام چغتائی اور خالد احمد کی رفاقت میں نومبر ۱۹۹۷ء میں پیش آیا تھا۔ لندن ہم نہ جا سکے تھے۔ سیمی نار کی روداد دیکھیے: ''اقبالیات'' جنوری ۱۹۹۸ء، نیز مشمولہ: ''تفہیم و تجزیہ'' لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۴ ڈاکٹر گیان چند کے دورہ لاہور میں انھیں ایک استقبالیہ تو ڈاکٹر وحید قریشی صاحب (ناظم مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور) نے عامر ہوٹل میں دیا تھا۔ دوسرے: شعبہ اردو اورینٹل کالج نے ان کے اعزاز میں سینٹ ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں نثار احمد فاروقی، ظفر احمد صدیقی (علی گڑھ) اور جاوید طفیل بھی شریک تھے۔

## خط نمبر ۹:

۱ والد مرحوم (محمد محبوب شاہ ہاشمی، م: ۱۳ جنوری ۱۹۹۸ء) کے بارے میں یہ مضمون ہفت روزہ ''ایشیا'' لاہور کے شمارہ ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا تھا۔

۲ ''ارمغان علمی'' کی ''تقدیم'' میں جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا: ''بطور خاص علمی تحقیق میں انہیں (ڈاکٹر وحید قریشی صاحب) کو استاد کا مقام حاصل ہے اور وہ حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، پروفیسر رشید حسن خاں اور جناب مشفق خواجہ کے سے اساتذۂ تحقیق کی صف میں شامل ہیں۔ خواجہ صاحب نے بعد کے خطوں میں بھی اصرار کیا کہ ان کا نام نکال دیا جائے، چنانچہ ان کے پیہم اصرار پر ہم نے ان کا نام حذف کر دیا۔


توضیحی کتابیات قائد اعظم لائبریری

| | |
|---|---|
| ۱۔ توضیحی کتابیات اصول فقہ | سید عبدالرحمٰن بخاری |
| ۲۔ علوم حدیث | حافظ خبیب احمد |
| ۳۔ گوہر نایاب | غلام احمد چوہدری |
| ۴۔ توضیحی کتابیات حدیث | حافظ خبیب احمد |

# انجمن ترقی اردو پاکستان

قائم شدہ ۱۹۰۳ء

اردو روڈ۔ کراچی ۱

ٹیلیفون: صدر دفتر: ۲۳۲۷۸۳ — اردو کالج: ۲۳۰۱۹۱ — انجمن پریس: ۷۰۳۱۲

شمار ..........

تاریخ .......... ۱۹۶ء


مکرمی و محترمی۔ آداب

آپ کی بے شمار عنایات کا بہت بہت شکریہ۔

تازہ ترین عنایت "منقبہ جان" ہے۔ یہ کتاب اندر سے بھی اتنی ہی خوبصورت ہے جتنی باہر سے۔ "ترخان" محبت کے سلسلے میں آپ کا خیال درست ہے۔ فرہنگ نظام میں لفظ "ترخان" کے یہی معنی ہیں۔

اس خط کے ساتھ محمد شفیق صدیقی (کمال ٹرسٹ اور آکسفورڈ کتاب والے) کے خط کی نقل بھیج رہا ہوں۔ اس میں انہوں نے اپنی ایک زیر ترتیب کتاب کی تفصیل لکھی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ مجلس سے معاملہ طے کرا دیں۔ میں اسے انجمن کی طرف سے چھاپ سکوں۔ انجمن میں معاوضہ دینے کی کوئی روایت نہیں اور اگر کسی کو فراخدلی سے معاوضہ دے بھی دیا جائے تو وہ شرمناک حد تک کم ہوتا ہے۔ یہ کتاب جیسا کہ خط سے معلوم ہوگا، نہایت اہم ہے۔ مجلس کی طرف سے اس کی اشاعت ہر اعتبار سے مجلس کے شایان شان ہوگی۔ مجھے امید ہے آپ قبلہ شیخ صاحب سے مشورہ کر کے جلد ہی مطلع فرمائیں گے۔ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

میں نے سنا ہے کہ تذکرہ کے ... عکس آپ کے پاس ہیں۔ لیکن مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔

انڈیا آفس کی فہرست کے جو صفحات کے عکس ابتدائی ... آپ ان سے لے لیجیے۔ ان میں سے دو تذکرے ہیں، ان کو علاحدہ کر کے عکس بنوا لیجیے گا۔

خدا کرے آپ بخیریت ہوں

مخلص جمیل

۱-۶-۶۸

بخدمت گرامی
ڈاکٹر وحید قریشی
(لاہور)

# انجمن ترقی اُردو پاکستان

قائم شدہ ۱۹۰۳ء

اردو روڈ۔ کراچی ۱

ٹیلیفون: صدر دفتر: ۲۳۲۷۸۴ — اردو کالج: ۲۳۰۱۹۱ — انجمن پریس: ۷۰۴۱۲

شمار ..........

تاریخ .......... ۱۹۶ء


عزیز محترمی - آداب

بہت دنوں سے آپ کا خط نہیں آیا۔ خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ انجمن کی جانب سے [illegible] ہیں

[illegible] کی قیمت [illegible] کی رسید ابھی نہیں ملی۔

ہمیں جناب ادریس [illegible] سے ملاقات ہوئی تو ان سے آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم ہوا۔ آپ نے کبھی [illegible] نہیں [illegible] کسی سے کوئی شکوہ اگر پیدا ہوا ہو [illegible] ان [illegible] دوست [illegible] گیا ہے۔

[illegible] کا مقدمہ آپ [illegible] کہ مطبع میں بھیج دیا۔ اس مقدمے کے بارے میں آپ نے [illegible] شکایت [illegible] اسے آپ ٹھیک [illegible] کر دیجیے۔

[illegible] کی اطلاع [illegible] ابھی [illegible] کوئی اطلاع نہیں دی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں

مخلص

شان الحق حقی

۱۵-۷-۶۶

بخدمت گرامی

ڈاکٹر وحید قریشی

لاہور

# انجمن ترقی اردو پاکستان

قائم شدہ ۱۹۰۳ء

اردو روڈ۔ کراچی ۱

ٹیلیفون
صدر دفتر: ۲۳۲۷۸۴
اردو کالج: ۲۳۰۱۹۱
انجمن پریس: ۷۰۳۱۲

شمار ..........

تاریخ .......... ۱۹۶ء


مخدومی، تسلیم

جمیل جالبی صاحب کے ذریعے "بزمِ خیال" وصول ہوئی، اس عنایت کا بہت بہت شکریہ۔

اس سے پہلے میں مسافر کے دو پرچے بھیج چکا ہوں، مکان کے پتے پر۔ غلطی سے شاید ۲۵۹ لکھ دیا تھا۔ وہ پرچے ملے یا نہیں؟

ہندوستان سے غالب کے بارے میں جو کچھ شائع ہوا ہے، اس میں سے آپ کے لیے کیا کیا چیزیں بھیج سکتا ہوں؟ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جو کتابیں آپ کے پاس نہ ہوں، وہ میں پیش کردوں۔ ایک صاحب ہندوستان سے آنے والے ہیں، توقع ہے کہ وہ بہت سی کتابیں ساتھ لائیں گے۔

---

آج کی ڈاک سے میں نے فرشِ معرکہ زیبا کا مقدمہ آپ کے نام بذریعہ رجسٹری بھیجا ہے۔ مجلس کے پتے پر۔ آپ ازراہِ کرم اس پر ایک نظر ڈال لیں اور جہاں جو تبدیلی چاہیں کردیں۔ بے حد کرم ہوگا۔ مقدمے کی وصولی کی اطلاع ضرور دیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب چاہتے ہیں کہ ان کا مقالہ قسطوں میں شائع نہ ہو۔

دعا کرتے رہیے، خیریت سے ہوں۔

کا مخلص

مشفق

۷-۶-۶۹ء

بزمِ گرامی
وحید قریشی
ڈاکٹر

۲/N

# تخلیق ادب

۳-ڈی-۵/۹-ناظم آباد-کراچی ۷۴۶۰۰


26-10-97

برادر عزیز و مکرم۔ سلام مسنون۔

آپ کا ۲ اکتوبر کا نوازش نامہ مل گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ [illegible]

اور آپ کا [illegible] کی طرف توجہ [illegible] ۱۲ سے ۱۶ گھنٹے [illegible] آرام [illegible] ہوں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

آپ کا خیر اندیش

مشفق خواجہ

26-10-97

بخدمت گرامی

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب

لاہور

۲/

تخلیق ادب

28-7-96

۲-ای-۲/۵-ناظم آباد-کراچی

برادر عزیز و مکرم سلام مسنون

گرامی نامہ موصول ہوا۔ [illegible] شکرگزار ہوں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اس لیے صرف [illegible] کے نام لکھ رہا ہوں۔

۱۔ ن م راشد ۲۔ اثر لکھنوی [illegible]

۳۔ ممتاز حسین ۴۔ ابراہیم جلیس

۵۔ اختر حسین رائے پوری ۶۔ اشرف صبوحی

۷۔ شیخ محمد اکرام ۸۔ امداد امام اثر

۹۔ [illegible] ۱۰۔ چراغ حسن حسرت

۱۱۔ عبدالمجید سالک ۱۲۔ ڈاکٹر تاثیر

۱۳۔ مولوی عبدالحق ۱۴۔ شوکت سبزواری

۱۵۔ خواجہ احمد فاروقی ۱۶۔ خواجہ حسن نظامی

۱۷۔ مجنوں گورکھپوری ۱۸۔ کنہیا لال کپور

۱۹۔ قاضی عبدالودود ۲۰۔ [illegible]

۲۱۔ وقار عظیم ۲۲۔ [illegible]

۲۳۔ ممتاز شیریں ۲۴۔ جوش [illegible]

۲۵۔ محمد حسن عسکری ۲۶۔ خواجہ غلام [illegible]

[illegible] خواجہ حسن نظامی، مولانا حالی، عبدالحلیم شرر جیسے مصنفین [illegible]

تخلیقی ادب

[illegible] ناظم آباد، کراچی

ضمیمہ

ان میں کچھ دوسرے موضوعات تو پی ایچ ڈی کی سطح کے کام کے متقاضی ہیں۔

۱۔ اردو میں لغت نگاری ۲۔ اردو میں قواعد نویسی ۳۔ اردو میں تحقیق

۴۔ اردو ادب عہد محمد شاہ میں ۵۔ عہد میر کے اردو شعرا ۶۔ اردو کا پہلا اہم ادبی مرکز اورنگ آباد

۷۔ پنجاب میں اردو نثر نگاری (قیام پاکستان سے قبل) ۸۔ ~~[illegible]~~ بیسویں صدی کے اردو رسائل (قیام پاکستان سے قبل) ۹۔ دکنی کا داستانی ادب ۱۰۔ برصغیر کے علمی و ادبی ادارے (قیام پاکستان سے قبل) ۱۱۔ اردو کے رومانی نثر نگار ۱۲۔ اردو اور پاکستانی علاقائی زبانوں میں مشترک عناصر ۱۳۔ اردو ادب کی تحریکیں

۱۴۔ اردو میں [illegible] سیرت ۱۵۔ اردو میں قرآن شریف کے تراجم

۱۶۔ اردو پر فارسی زبان و ادب کے اثرات

مگر مشکل یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں [illegible] اور ان کے [illegible] کو اردو میں کام کا [illegible] کی صلاحیت رکھنے والے [illegible] ایسے اساتذہ بہت کم ہیں [illegible] آپ جیسے [illegible] اساتذہ [illegible] [illegible] ہیں۔

[illegible]

[illegible] اردو [illegible]

آپ کا مخلص

مشفق خواجہ

۲۸-۷-۱۹۷

بخدمت گرامی

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب

لاہور

# تنقید کا ساختیاتی رخ

تحسین زہرا

ساخت کا تصور مشہور سائنسدانی ماہر لسانیات فرڈینینڈ ڈی سوسیئر نے پیش کیا۔ ساختیات (Structuralism) بنیادی طور پر ادراک حقیقت کا ایک اصول ہے۔ اس اصول کے ذریعے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ حقیقت (کائنات) انسانی شعور وادراک کا حصہ کس طرح بنتی ہے؟ اشیاء کی معنی خیزی کن بنیادوں پر قائم ہے اور معنی خیزی کا عمل کیسے ممکن ہے؟ نیز یہ کہ معنی خیزی کیوں کر جاری رہتی ہے؟ ساختیاتی تنقید نے ساختیاتی لسانیات اور ساختیاتی علم الانسان سے اثرات قبول کیے ہیں۔ ان کے بانیوں میں ماہرین لسانیات، فلاسفر اور ماہرین نفسیات، طبعیات اور ماہرین قواعد کے نام ملتے ہیں۔

فرڈینینڈ ڈی سوسیئر کے اس خیال سے لسانیات کی اس شاخ کی داغ بیل پڑی کہ جس طرح حیاتیات کے مطالعہ میں ساختیاتی (Structrual) اور جینیاتی محور (Genetic Axls) ہوتے ہیں۔ لسانیات میں بھی ایک صوتیہ (Phenonem) کا جمودی (Symchronic) اور تاریخی (Diachronic) مطالعہ ہوسکتا ہے۔

واضح رہے کہ صوتیہ کا تاریخی مطالعہ مخصوص زمان ومکان کے محور سے ہوتا ہے۔ سوسیئر کا خیال ہے کہ زبان کی ساخت سے مراد، زبان کے مختلف عناصر کے درمیان رشتوں کا وہ نظام ہے جس کی بنا پر زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ساخت کا تصور چونکہ تجریدی تصور ہے اس لیے اس کی وضاحت کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے لاتعداد معنوی ابعاد ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عناصر میں رشتوں کا نظام جو نوعیت کے لحاظ سے جداگانہ استعاراتی اظہار جیسا ہے اور جس کے سبب سے معانی کا ایک جہان آباد ہوتا ہے، ساخت (Structure) کہلاتا ہے۔

ساختیات میں ساختیہ سے مراد ڈھانچہ نہیں ہے اس لیے کہ ڈھانچہ تو ایک ٹھوس شے ہے، جب کہ ساختیات میں ساختیہ ٹھوس اجزاء کے بجائے رشتوں (Relations) پر مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا ساختیات میں ساختیہ ایک ایسا منضبط نظام ہے جس کا ایک مخصوص قاعدہ اور کلیہ ہے۔ اپنی آسانی کے لیے ہم اسے ''کوڈ'' یا قواعد (گرائمر) کا نام دے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:۔

> ''ساختیات (Structuralism) نہ صرف زبان وادب کی ماہیت کے بارے میں بلکہ ذہن انسانی کی کارکردگی کے بارے میں، یعنی ذہن انسانی اعلام واشیاء کو کس طرح دیکھتا ہے اور حقیقت کا ادراک کس طرح کرتا ہے، ان مسائل کے بارے میں جو بنیادی سوال اٹھائے ہیں اور ادبی متن، معنی کی نوعیت، قاری کے کردار نیز قرأت کے عمل کے بارے میں جو ریڈیکل نقطہ نظر پیش کیا ہے پچھلی تین دہائیوں سے وہ بحث کا

موضوع بنا ہوا ہے''۔

علم الانسان کے باب میں لیوی سٹراس (Levi Strauss) نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے کہ جب ہم اسطورہ (Myth) کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اسطورہ محض دیومالائی کہانیوں کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ ان کی حاصل جمع سے ''کچھ زیادہ'' ہے۔ افلاطون نے کہا تھا، کرسی سے اہم کرسی کا ''خیال'' ہے کیونکہ اگر کرسی ٹوٹ جائے تو ''کرسی کے خیال'' کے مطابق دوسری کرسی بنائی جا سکتی ہے لیکن اگر کرسی کا ''خیال'' باقی نہ رہے تو پھر کرسی دوبارہ تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس بیسویں صدی میں ساختیات کے ماہرین نے خیال کے مقابلے میں ساختیے کو اہمیت دی ہے۔ اس لیے کہ خیال کے متعین معنی نہیں ہوتے ہیں، جو اسے زمان و مکان کی حدود میں جکڑ لیتے ہیں جبکہ ''ساختیہ'' ایک ایسی شے ہے جو اصلاً صرف رشتوں کی ایک ''اکائی'' ہے لہٰذا ہر ساختیہ کی ایک اپنی مملکت خداداد ہے جس میں اس کا اپنا سکہ چلتا ہے۔ اس طرح کلی طور پر تو نہیں لیکن کسی حد تک خیال کا تصور ''علامت'' سے قریب ہے اور ساختیے کا تصور استعارے سے قریب ہے۔

ساختیاتی لسانیات کے بانیوں میں ایڈمنڈ ہسرل اپنی مظہریات کے لیے، روڈولف کارنیس اپنی منطق کے لیے، اور وٹ گن اسٹائن مثالی زبان کے بارے میں فلسفہ لسان کے ضمن میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح فریڈرک جیمز ساختیت کو زبان، استعارے یا ہیت کے نظام کے مترادف گردانتا ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ افراد یا اشیاء کو دیے گئے نام محض نشان (Signs) ہیں۔ جبکہ ہمارے خیال میں استعارے میں معانی کی تہہ در تہہ کیفیات ملتی ہیں اور ساختیہ استعارے سے قریب تر ہے۔ فریڈرک جیمز کے تصور نشان میں معانی کا تجزیہ کرتے جائیں تو بالآخر حقیقی اور آخری معانی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور یوں یہ صورت بھی نشان (Sign) کو محدود کر دیتی ہے۔ یوں ساختیات، زبان سے براہ راست تعلق رکھتی ہے اس لیے شاعری اور ادب کے مختلف اجزاء کو پرکھتے ہوئے ایک اور ایک دو والا معاملہ پیش نہیں کرتی اور تاثر کی سطح پر حاصل جمع کی قائل نہیں، اس لیے اسے ہم ''کچھ زیادہ'' بلکہ ''لامحدود'' ہی کہیں گے۔ ساختیات کے ''ساختیے'' کا کمال یہ ہے کہ استعارے کی طرح لغت (ڈکشنری) کے مرجھائے ہوئے پھولوں (الفاظ) کے اپنے اوپر حملے کی صورت میں بھرپور مزاحمت کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک زندہ جسم پر کسی بیماری کے جراثیم (بیکٹیریا) حملہ آور ہوں تو جسم ان کا مقابلہ کرنے کے لیے Anti Bodies پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن اگر حملہ آور کسی طور ساختیہ میں داخل ہو جائے تو پھر ساختیہ اسے اپنی کایا کلپ کے لیے بھی استعمال کرتا ہے۔ کلچر کے سلسلے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اگر وقتاً فوقتاً باہر سے کوئی تہذیب کلچر کے ساختیے میں داخل نہ ہوتی رہے تو کلچر پر انجماد طاری ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی نئی تہذیب حملہ آور ہوتی ہے تو کلچر نئے سسٹم کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور دوبارہ ہرا ہو جاتا ہے۔ ساختیے کا یہ کردار بھی استعارے سے مماثل ہے۔

ساختیہ کے باب میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے ہماری رائے سے قدرے مختلف ہے۔ یعنی جسے ہم استعارے کی مانند قرار دے رہے ہیں اسے وزیر آغا، علامت سے قریب تر بتا رہے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''سٹرکچر ایک خودمختار اور خودکفیل ''شے'' ہے۔ جس کی اپنی دنیا، اپنے اصول اور قوانین ہیں۔ وہ باہر کے ہر نظام یا سسٹم سے خود کو الگ تھلگ رکھنے پر قادر ہے۔ نیز اپنی قطعہ بند دنیا میں کسی دوسرے سسٹم کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا''۔[۳]

چونکہ ساختیات کو لسانیات سے گہرا ربط ہے اس بناء پر ساختیاتی تنقید یہ موقف بھی اختیار کرتی ہے کہ ادب، زبان کو استعمال تو کرتا ہے لیکن وہ خود بھی ایک ''زبان'' ہی ہے اور ادب کا تجزیہ دراصل زبان کے تجزیے کے مترادف ہے۔ رولاں بارت اس حوالے سے لکھتا ہے کہ ساختیات کا منتہائے مقصود ''ترتیب نو'' نہیں بلکہ ''تربیت نو'' ہے اس لیے کہ شے کی کارکردگی اہم ہے۔

مطالعہ ادب میں تین طرح سے ساختیات نے اظہار پایا:۔

۱۔ ساختیاتی تنقید ۲۔ ساختیاتی روداد نگاری ۳۔ لسانی ساختیاتی تشریح متن۔

ساختیاتی تنقید کا تصور فلسفیانہ صورت میں خاصی پیچیدگی کا حامل ہے۔ بالخصوص وہ مباحث جو لسانی تشکیل سے وابستہ ہیں۔ ساختیاتی طریقہ تنقید کو "MOSAIC" یا "Picture Blocks" کی مثال سے سمجھاتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:۔

''ان دونوں میں وضع قطع اور رنگوں کے ٹکڑوں کی درست ترتیب سے تصویر مکمل ہو کر اپنا مخصوص تاثر پیدا کرتی ہے۔ ہر ٹکڑا اپنی انفرادی صورت میں بدہیئت یا بے معنی ہی کیوں نہ محسوس ہو لیکن وہ اسے کل سے جنم لینے والی کلیت کی تشکیل کے لیے لازمی حیثیت رکھتا ہے، بالکل اسی انداز پر ادب پارے میں داخلی وحدتوں کا ایسا نظام ملتا ہے جس کے مختلف اجزا باہمی رابطے ہی سے ہیئت کل کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان متنوع اجزا کے اپنے وجود کے ثبات کا انحصار دوسرے اجزا کے وجود کو تسلیم کرنے پر ہوتا ہے۔ ساختیاتی نقاد پکچر بلاکس کی مانند ادب پارے کے مختلف النوع مگر باہمی اجزا کو لے کر الگ الگ کر دیتا ہے اور پھر انہیں نئے سرے سے جوڑ کر تصویر مکمل کرتا ہے۔ اگرچہ یہ تصویر بھی پہلی اور اصل تصویر جیسی ہی ہوتی ہے لیکن اب اس میں نقاد کی بصیرت بھی شامل ہو چکی ہے وہ ادب پارے میں مختلف اجزا کے کل بننے کی داستان سمجھ چکا ہے''۔[۴]

مغرب میں ساختیات کے نظریے سے قبل سوچ کا وہ انداز رائج تھا جو علت و معلول کے کھیل سے مشابہ تھا۔ سوچ کا یہ انداز اس سائنسی مفروضے پر قائم تھا کہ شے اپنا ایک ٹھوس وجود رکھتی ہے ہر عمل دوسرے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور نئے عمل کا محرک بھی۔ یوں کائنات اور زندگی کے مظاہر بعد ازاں آغاز تا انتہا ایک سیدھے خط پر سفر کرتے ہیں۔ ساختیات کا یہ نظریہ محض طبیعیات تک محدود نہیں رہا۔ نفسیات، لسانیات، فلسفہ، علم الحیات، علم الانسان اور دیگر علوم میں بھی اسے خاصی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ مثلاً لسانیات کے ضمن میں کہا گیا کہ عام گفتگو (PAROLE) کے پس پشت زبان بطور ایک سسٹم یا قواعد موجود ہوتی ہے جس کے مطابق ہم گفتگو کرتے ہیں۔ (نوام چامسکی نے گفتگو اور زبان کے لیے COMPETENCE اور PERFORMENCE کے الفاظ استعمال کیے ہیں

جو زیادہ برمحل ہیں) اسی طرح لگ بھگ ستر برس قبل برگساں نے زمانِ تسلسل (SERIALTIME) کے ضمن میں مرور زماں DURATION کا نظریہ پیش کیا۔ جس میں سارے زمانے رشتوں کی صورت میں بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ سگمنڈ فرائڈ نے شعور کی فعال دنیا کے پس پشت لاشعور کی موجودگی کا انکشاف کیا اور اس کے شاگرد ژونگ نے اجتماعی لاشعور کا تصور پیش کیا جو ARCHTYPE سے عبارت ہے، یعنی ان غیر مرئی کھائیوں پر مشتمل ہے جو طبعی رجحانات کو STRUCTURING کر کے انہیں متخیلہ میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اسی طرح ادب کے حوالے سے ٹی۔ ایس ایلیٹ نے روایت کا نظریہ پیش کیا جو ایک ساختیہ ہے جس کے حال میں پورا ماضی چھپا ہوتا ہے۔

ساختیات میں ساختیہ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ دوئی پر استوار ہوتا ہے۔ ''ایک'' کی کوئی ساخت نہیں ہوتی لیکن جب ایک، دو میں تقسیم ہوتا ہے اور دونوں حصے ایک دوسرے کے روبرو آ جاتے ہیں تو ایک ایسا رشتہ ابھرتا ہے جس سے لاتعداد نئے رشتے جنم لیتے ہیں۔ اس طرح ایک کے اندر دوئی کے جنم اور اس کے دائرہ در دائرہ پھیلاؤ سے رشتوں کا ایک جہان آباد ہو جاتا ہے جسے ہم ساختیہ کا پیٹرن کہتے ہیں۔

یوں بیسویں صدی کی سائنس اس نتیجہ پر پہنچی کہ کائنات ایک سٹرکچر ہے جس کا ہر دم متحرک پیٹرن رشتوں کی ایک گرہ ہے۔ تاہم اس کے بطون میں ایک سسٹم یا قواعد بھی ہے جس سے کائنات کا سارا تنوع جنم لیتا ہے۔ ساختیہ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ساختیہ کے دو چہرے ہوتے ہیں ایک وہ جو بیرونی چہرہ ہے لیکن نظر نہیں آتا، مگر جس کی عدم موجودگی کا علم ظاہری چہرے کی کارکردگی سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ ساختیہ کا ظاہری چہرہ رشتوں کا ایک ایسا جال ہے جس میں اشیا ہمہ وقت ایک دوسرے سے جڑتی اور الگ ہوتی رہتی ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ زبان SELECTION اور COMBINATION کے دوگونہ عمل سے مرتب ہو کر ایک اسٹرکچر بناتی ہے یہی صورت دماغ کی ہے۔ گویا کائنات میں جو ہمہ گیر تنظیم نظر آتی ہے وہ انسانی ذہن کے اسٹرکچر ہی کا عطیہ ہے۔ اس طرح بقول ڈاکٹر وزیر آغا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دماغ نے اپنی شکل وصورت کے مطابق زبان کو خلق کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جس طرح ساختیاتی تنقید نے ''رشتے کی قدر'' کا اصول جدید طبعیات سے اخذ کیا تھا جس کے مطابق اشیا کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اصل حقیقت وہ ''رشتہ'' ہے جس میں وہ بندھی ہوئی ہیں۔ اگر رشتے کی گرہ کھل جائے تو پھر اشیاء کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔۵

اس کی ایک مثال انسانی جسم ہے جو عناصر کی گرہ ہے۔ جب یہ گرہ کھلتی ہے تو عناصر بکھر جاتے ہیں اور جسم کی موت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ساختیات نے طبعیات سے یہ بات قبول کی کہ ہر PARTICLE ایک سیال قوت ہے یعنی اپنے اندر تبدیلی کا جوہر رکھتی ہے۔ گویا ساختیات نے تحریری زبان کے الفاظ کو PARTICLE کا ہم پلہ قرار دیتے ہوئے تحریر کی اس سیال قوت کا احساس دلایا ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:۔

''ہر صورت اپنے اظہار کے لیے ''کلمہ'' کی محتاج ہے اور کلمے کا مطالعہ، زبان کے اندر دوسرے کلموں سے

اس کی مطابقتیں، رشتے اوران رشتوں کے کلی نظام کا تصور جدید لسانیات کا مرکزی تصور ہے جس کی بنا پر نوام چومسکی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسان فطری طور پر زبان کے امکانات کو ایک خاص وضع سے منظم کرنے اوران کو بروئے کار لانے کی خلقی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کسی نہ کسی طرح کی ''آفاقی گرامر'' میں شریک ہے جس کی رو سے اس کے لیے اپنی زبان کو خلق کرنا، ضرورت کے مطابق نئے گرائمری کلمے وضع کرنا اورانہیں ترسیل کے لیے استعمال کرنا ممکن ہو جاتا ہے''۔[۶]

دیکھا جائے تو ساختیاتی فکر نے ادبی سطح پر ماضی کے بہت سے مبنی بر عقل اعتقادات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ جیسے صدیوں سے یہ خیال چلا آ رہا تھا کہ ادب، مصنف کے تخلیقی ذہن کا کارنامہ ہے یا ادب اظہار ذات ہے یا متن وہ تخلیق ہے جو مصنف کے وجود اور اس کے ذہن وشعور کی پیداوار ہے یا یہ کہ ادب، حقیقت کا ترجمان ہوتا ہے۔ ساختیاتی تنقید ان میں سے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر اس کا اصرار ہے کہ حقیقت، فقط اسی قدر ہے جس قدر ہم اس کو اپنے لسانی نظام سے انگیز کر سکتے ہیں یعنی اصل حقیقت بہر صورت تخلیق کردہ متن سے دور ہی رہتی ہے اس تک کامل رسائی کسی طور ممکن نہیں۔

جہاں تک ساختیاتی تنقید پر اعتراض کا معاملہ ہے تو کہا جاتا ہے کہ ساختیاتی تنقید نے بلاوجہ دوسرے علوم بالخصوص طبیعیات، فلسفہ، نفسیات، علم الانسان اور لسانیات کا بوجھ تنقید پر ڈال دیا ہے۔ بقول جونتھن کلر، اصل بات یہ ہے کہ ساختیاتی تنقید نے ان تمام علوم کی مدد سے تخلیق میں مضمر معنی کی تشریح کرنے کی بجائے ان اسٹرکچروں پر توجہ مبذول کی ہے جو معنی کی تخلیق کرتے ہیں، چاہے ان کا تعلق نفسیات سے ہو یا فلسفہ، طبیعیات، منطق، لسانیات اور علم الانسان وغیرہ سے۔ ساختیاتی تنقید پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس نے ادبی طریقہ کار کی بجائے سائنسی طریقہ کار اختیار کیا۔ تیسرا اعتراض یہ کہ اس کا انداز میکانکی ہے۔ چوتھا یہ کہ اس نے تخلیق کار کی نفی کر کے قاری کو اہمیت دی۔ جہاں تک نئی تنقید اور ساختیاتی تنقید کے باہمی اختلاف کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''نئی تنقید'' نے ادبی تخلیق کی خود مختاری کا اعلان کیا تھا۔ جبکہ ساختیاتی فکر کے تحت ''زبان'' کی خود مختیاری کا اعلان کیا گیا۔ نیز یہ کہ ساختیاتی فکر کے مطابق تنقید کا مقصد محض تخلیق کا تجزیاتی مطالعہ نہیں بلکہ مختلف ادب پاروں کو چھو کر ان کے وجود میں کارفرما ایک ادبی Model کی دریافت کرنا بھی ہے۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے، ہمارے ہاں اسٹرکچرل ازم کی اب تک گھن گھرج تو سنائی نہیں دے رہی البتہ کچھ کچھ اشارے کنائے ضرور ہیں۔ خاص طور پر ساختیاتی مطالعوں کی بات اس زمانے میں بہت ہوئی جب امریکہ سے ایک طالبہ لنڈا وینگ اردو افسانے سے متعلق اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنے بھارت سے پاکستان آئی۔ لنڈا وینگ نے پاکستان سے انتظار حسین، انور سجاد، مسعود اشعر، مرزا حامد بیگ، منشا یاد، احمد داؤد، احمد جاوید اور رخسانہ صولت کے افسانوں کے ساختیاتی مطالعے اپنے مقالہ کا حصہ بنائے، جبکہ بھارت کے بلراج مین را، سریندر پرکاش، جوگندر پال اور قمر احسن کے افسانوں کا ساختیاتی مطالعہ وہ پہلے سے مکمل کر چکی تھی۔ یاد رہے کہ اردو میں ساختیاتی تنقید کی اولین مثال ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا تحریر کردہ مرزا حامد بیگ کے افسانوی مجموعہ ''گمشدہ کلمات'' (طبع اول جنوری ۱۹۸۱) کا دیباچہ ہے اس کے بعد ڈاکٹر سلیم اختر کا تحریر کردہ ایک مضمون اور پھر فہیم اعظمی کے تحریر کردہ چند تجزیے سامنے آئے۔ یوں رفتہ رفتہ اردو ادب میں بھی

اس طرف توجہ دے جانے لگی۔ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب ساختیات کے مباحث کا دائرہ وسیع ہوا تو مختلف مفکرین نے ان سے وابستہ امکانات کے ضمن میں مزید سعی کی۔ یہاں ایک بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ ساختیات سے پسِ ساختیات کی تبدیلی بہت سوں کے لیے واضح نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ جن فلسفیوں کی تحریروں سے پس ساختیات کا آغاز ہوا، ان میں سے زیادہ تر فرانسیسی تھے لیکن فرانس میں اسے ''پس ساختیات'' نہیں کہا گیا یہ نام باہر والوں کا دیا ہوا ہے اور شروع میں اس کی حدود واضح نہیں تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو کئی برس پہلے جوتھن کلر کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی کہ ساختیات اور پس ساختیات کی حد امتیاز خاصی مبہم ہے لیکن یہ صورت حال اب بدل چکی ہے اور نہ صرف انحراف مکمل ہو چکا ہے بلکہ پسِ ساختیاتی مؤقف فلسفیانہ اعتبار سے پوری طرح مستحکم بھی ہو چکا ہے۔ یوں پس ساختیات، ساختیات کی تشکیل نو ہے۔ پس ساختیات کے اثرات سب سے پہلے امریکہ میں پھیلے اور بعد میں برطانیہ میں۔ لیکن برطانیہ میں جو اثر مرتب ہوا وہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ امریکہ میں پس ساختیات کو ان لوگوں نے گلے لگایا جو امریکی ''نئی تنقید'' کی معروضیت سے نجات کی راہ ڈھونڈ رہے تھے اور یہی صورت حال بھارت میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے جبکہ برطانیہ میں پس ساختیاتی فکر کو ریڈیکل اور سیاسی قوت کے طور پر دیکھا گیا۔ یہاں آتھیوسے کے خیالات ستر کی دہائی سے بھی پہلے پہنچ چکے تھے امریکہ میں سب سے زیادہ اثر دریدا اور لاکان کا ہوا۔ جہاں تک دریدا کا معاملہ ہے تو یہی وہ شخص ہے جس کے خیالات کے لیے باقاعدہ طور پر زبان، متن اور قاری کے باہمی تعلق کے ضمن میں ''پس ساختیات'' کی اصطلاح وضع کی گئی۔ اسی طرح انٹنی ایسٹ ہوپ نے "BRITISH POST-STRUCTURALISM SINCE 1968" میں اس مسئلے پر کھل کر بحث کی ہے اور متعدد مارکسی مصنفین مثلاً کولن جیکب، ٹونی بینٹ، ٹیری ایگلٹن اور رابرٹ ژونگ کی تصانیف سے بحث کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ''پس ساختیات'' کا اثر صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ایسٹ ہوپ کا کہنا ہے کہ ادب کے علاوہ ثقافت کے دیگر شعبوں مثلاً آرٹ، میلولائیٹر کے فیتے اور موسیقی کے شعبہ جات میں بھی پس ساختیات کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔

اور تو اور تحریک نسوانیت کے مباحث میں بھی پس ساختیاتی فکر سے مدد لی گئی ہے جس کا بہترین ثبوت کرس ویڈن کی کتاب "Feminist Practice and Post Structuralist Theory" ہے۔ اس طرح رولاں بارتھ کو پس ساختیات کا پیش رو قرار دیا جا سکتا ہے جو فرانس کے ساختیاتی مفکروں اور ادبی نقادوں میں سب سے زیادہ دلچسپ، نکتہ رس اور بے باک نظریہ ساز تھا۔ رولاں بارتھ کی پس ساختیاتی فکر کا بہترین اظہار اس کے مختصر مضمون "The Death of the Author" میں ہوا ہے۔

بارتھ کا مشہور قول ہے کہ:

"The text is read without the father's signature"

پس ساختیاتی تھیوری کے ضمن میں ژاک دریدا کا نام بھی اہم ہے۔ اس نے ''پس ساختیاتی'' اس نے ردِ ساختیات کا اہم ترین نظریہ پیش کیا جو اپنے ذہنی رویے کی بنا پر پسِ ساختیاتی اس لیے ہے کہ وہ ساخت کو اس کے پہلے سے دیے گئے متعین معنی میں قبول نہیں کرتی۔ ژاک دریدا ردِ تشکیل اس ساختیاتی معروضے پر بھی سوالہ نشان لگاتا ہے کہ ''معنی کی ساختیں ذہن انسانی سے مطابقت رکھتی ہیں جو فہم و ادراک میں جاگزیں ہیں''۔

قمر جلیل ژاک دریدا کے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''دریدا کی پسِ ساختیاتی فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ گویا متن میں تیقن کی تلاش کو ترک کر دینا چاہیے۔ بلکہ متن کو صرف متن کے عناصر کا کھیل سمجھنا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں سچائی ایک کھیل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس سے بس لطف اندوز ہونا چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ کبھی متن کے اندر اتر کر دیکھیے، ہر متن کے اندر کئی متن بنے ہوتے ہیں اور تحریریں تضادات سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے خیال میں گفتگو اور ادب میں فرق ہوتا ہے۔ گفتگو میں بات چیت کرنے والے ایک دوسرے کا قطعی مفہوم واضح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں لیکن ادب میں اس کے برعکس کھیل کا عنصر اتنا اہم اور نمایاں ہوتا ہے کہ قاری جو معنی چاہے کسی ادب پارے کو پہنچا سکتا ہے''۔ ۷

یوں کہا جا سکتا ہے کہ تنقید، معنی کے تعین اور تعین متن کے سلسلے میں جس طرح نئی تنقید (نتیجہ خیز) ثابت نہیں ہوئی اسی طرح ساختیاتی تنقید اور پس ساختیات بھی بہت ممکن ہے کہ آنے والے دور میں رد ہو جائیں۔ فی الوقت تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر زاویہ نگاہ میں سچائی کی ایک آدھ رمق ضرور موجود ہے۔ تبدیل ہوتے ہوئے انسانی ذہن اور ادراک حقیقت کے طفیل ساتویں دہائی کے آخری برسوں میں ساختیات کی جگہ باقاعدہ پس ساختیات نے لینا شروع کی۔ پس ساختیات کے ماہرین دراصل ساختیاتی تنقید ہی کے ماہرین تھے جن کو ساختیات کی معذوریوں کا رفتہ رفتہ احساس ہوا اور وہ سختی سے اپنا محاسبہ کرتے چلے گئے۔ ''میلڈن تو یہاں تک کہتا ہے کہ غور سے دیکھا جائے تو ساختیات کے بانی سوسیئر کے فلسفے ہی میں پس ساختیات کے عناصر مل جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:۔

''پس ساختیات کے بہت سے تصورات یا تو ساختیاتی فکر کی توسیع ہیں یا ساختیات سے انحراف ہیں لیکن یہ انحراف ساختیات ہی کے کسی نہ کسی مقام سے ہے''۔ ۸

یوں ساختیاتی فکر نے تنقید کے پرانے قصر میں دراڑیں ڈال دیں اور تنقید کے نئے تعمیر شدہ ساختیاتی ڈھانچے کے باقی ماندہ کھانچے پس ساختیات مکمل کیا چاہتی ہے۔

## حواشی و حوالہ جات


۱ نارنگ، ڈاکٹر گوپی چند ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، طبع اول، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹

۲ بہ حوالہ "Prison House of Language" کراچی

۳ وزیر آغا، ڈاکٹر۔ تنقید اور جدید اردو تنقید، انجمن ترقی اردو (پاکستان)، طبع اول: ۱۹۸۹ء، ص ۲۵

۴ سلیم اختر، ڈاکٹر۔ تنقیدی دبستان۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور: طبع ۱۹۹۷ء، ص ۲۳۱۔۲۳۲

۵ وزیر آغا، ڈاکٹر: تنقید اور جدید اردو تنقید

۶ ''ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، ص ۳۷

۷ قمر جلیل۔ ژاک دریدا اور پس ساختیات۔ مشمولہ ''پاکستانی ادب'' (حصہ نثر) مرتبہ رشید امجد، طبع اول، ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۱

۸ ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ ص ۵۲۰

# مکاشفے کی نفسیات

## (ہیلڈا ڈولٹل Hilda Doolitle)

ڈاکٹر شاہین مفتی

۱۹۵۹ء میں برانڈیس یونیورسٹی سے کریٹیو ایوارڈ اور ۱۹۶۰ء میں امریکن اکیڈمی آف آرٹ اینڈ لیٹرز کی جانب سے خاتون اول کا خصوصی تمغہ حاصل کرنے والی ہیلڈا ڈولٹل جسے دنیائے ادب اس کے مخفف ایچ ڈی کے نام سے جانتی ہے۔ ۱۰ ستمبر ۱۸۸۶ء کو پنسلوانیا کے علاقے بتھلیم میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی زندگی عمومی انداز سے بسر کرنے کے بعد ۱۹۰۳ء میں اس نے بائرن میور کالج میں داخلہ لیا لیکن خرابی صحت کے باعث یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا، آنے والے پانچ چھ برس وہ تصنیف و تالیف کے کام میں الجھی رہی اسی اثنا میں اسے خیال اور لفظ کے مابین بنتی بگڑتی تماثیل کے تسلسل سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں اس نے سفر کا ارادہ کیا ازاں بعد گھومتے پھرتے اس نے انگلستان میں مستقل رہائش اختیار کی اور یہیں دو برس بعد اس نے ایک برطانوی شاعر ایل ڈی لنگٹن سے شادی کر لی لنگٹن شعری محاکات اور اظہاریت پسند تحریک سے وابستہ تھا۔ ہیڈی کی زندگی میں التباسات کی موجودگی اس یک جائی کا باعث بنی۔ ۱۹۱۶ء میں اس کی پہلی کتاب سی گارڈن Sea Garden شائع ہوئی۔ کچھ عرصہ تک وہ ایک معروف رسالے ایگوئسٹ (Egoist) کی نائب مدیرہ کے طور پر بھی کام کرتی رہی، ازاں بعد اس نے یہ عہدہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے لیے خالی کیا، ۱۹۱۸ء میں تقریباً تئیس برس کی عمر میں اس کی ملاقات تاریخی ناول نگار ون فریڈ ایلرمین سے ہوئی جو اپنی تحریروں کو قلمی نام ''برائے ہر۔ Bryher'' کے زیر اہتمام شائع کرتا اور قارئین کے حلقے میں اسی نام سے پہچانا جاتا تھا۔ یہ مراسم ہیڈی کے لیے بہت ہی سود مند ثابت ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں اس کی بیٹی ''پردتا'' نے جنم لیا اور اسی برس ہیلڈا نے لنگٹن سے طلاق لے لی بقیہ زندگی برائے ہر کے ساتھ بسر ہوئی۔ دونوں آنے والے کئی برسوں میں یونان، مصر، سوئٹزرلینڈ اور دوسرے ممالک میں گھومتے پھرے۔ ہیڈی نے اس اثنا میں بہت کچھ سیکھا۔ اس کی کتاب فیوریس پیس (Furious Pace) اور اس کی نظموں کا مجموعہ ''ہیلی ڈورا اور دوسری نظمیں'' ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۲۶ء میں اس کی کتاب ''پلمپسیسٹ Palimpsest'' چھپی۔ ۱۹۲۷ء میں ایک منظوم ڈراما ''ٹمپورائزز Temporizes شائع ہوا اور ۱۹۳۱ء میں ''برونز کے لیے سرخ گلاب Red Roses for Bronze'' منصۂ شہود پر آئی۔ ۱۹۳۳ء میں ہیلڈا پر اس کے التباسات کا دباؤ شدت اختیار کر گیا۔ وہ تقریباً دو اڑھائی برس فرائڈ کے زیر علاج رہی اس نے اپنا یہ تجربہ ایک مضمون ''فرائڈ کے لیے خراج تحسین Tribute to Freud میں قلم بند کیا ہے۔ یہ مضمون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ اٹھائیس ستمبر ۱۹۶۱ء میں

ہیلڈا کی وفات تک اس کی مزید دس کتابیں چھپ چکی تھیں۔ ''دیواریں نہیں گرتیں The Walls do not fall''، ''تین جنگی گھوڑوں کی سواری War Trilogy''، ''کہو کہ میں زندہ رہوں Bid me to live''، ''ہیلن مصر میں Helen in Egypt'' کے علاوہ بچوں کی کہانی ''ہیڈگی لاگ Hedgelog'' نے کافی شہرت حاصل کی۔

ہیڈی کی معروف اور مصروف زندگی میں اس کے التباسات جس طرح درجہ بدرجہ مکاشفات میں ڈھلے، ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ تخلیق کاروں کی زندگی میں قوت متخیلہ وہ اعجاز ہے جو انھیں عام انسانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ شاعرانہ ہسٹریائی کیفیت کب الہام میں تبدیل ہوتی ہے اس کا اندازہ تو شاید فرائڈ کو بھی نہ ہو سکا ہو لیکن اس اسرار کا کشف تخلیق کاروں کے بیانات کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ بقول ہیڈی:

یہ اس کا تحفہ ہے
روشنی
روشنی
فقط ایک لہر
جو ہمیں دور بہا کر لے جاتی ہے
پرانے خوف اور مغلوب کرنے والی طاقتوں سے

اپنی ایک اور نظم میں وہ لکھتی ہے:

سکرین پر روحیں ہیں
وہ زندگی گزارتی جو شاید کہیں اور ہے
وہ زندگی جو ہمیشہ رہے گی

آخر یہ روشنی کیا ہے۔ شاعرانہ التباس کی وہ شخصیت کون ہے جس کے لیے لفظ ''وہ'' کا مخصوص استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ ہمیشہ کی زندگی کہاں ہے جس کا بلاوہ انسانی زندگیوں میں بیک وقت اضطراب اور آسودگی پیدا کرتا ہے۔ ہیڈی کی تحریریں اسی الجھن کے کھوج میں ہیں۔ یوں تو شاعرانہ مکاشفے کی اسی سرحد پر کھڑے میرؔ کو گمان گزرا تھا:

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر — منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

غالبؔ اپنے شعوری ارتکاز کی وحشت میں مبتلا ہوا۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریٔ وہم — کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

قبالؔ اسی ایک لمحے کی گرفت سے ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔

کثرت جلوہ سے چشم شوق کس مشکل میں ہے — اتنی شمعیں کب ہیں جتنی روشنی محفل میں ہے

آنکھ اور کائنات کے درمیان جس پتلی تماشے کی بساط بچھی ہے اس کا اصلی سرا کہاں ہے۔ تمثیل سازی کے اس عمل میں کسی اور ہی دن اور دنیا کی سانس لیتی موجودگی کا امکان اور ہیولے کا پیراہن اوڑھے دوڑتی بھاگتی پرچھائیوں کی سرگرمیاں آخر ہم سب کے لیے کس امکان کے بلاوے ہیں۔ اس کا جواب مختلف ہوسکتا ہے لیکن انکشاف کے کسی ایسے ہی لمحے والٹیئر پکارا تھا روشنی، روشنی .....شاید وہ خیال اور شعور کے درمیانی مہین پردے پر آشکارا ان چہروں اور ان منظروں کو پہچاننا چاہتا تھا جو اس کی تلاش میں صدیوں کا سفر کر کے اس تک پہنچے تھے یا وہ اپنی نئی زندگی کی دستاویزی فلم کے مناظر کی ریہرسل سے بہرہ مند ہو رہا تھا اور تصویریں کبھی بہت روشن اور کبھی بہت مدھم ہونے کے باعث زیادہ استقلال سے دیکھی نہیں جاسکتی تھیں۔ آیئے ہم مکاشفے کی اس عجلت کو جسے اکثر اوقات دیوانگی کی الجھن یا خیال کا ابہام کہا جاتا ہے، ہیڈی کے التباسی تجربے میں سمجھنے کی کوشش کریں۔

۱۹۲۰ء میں کورفو کے جزیرے پر جب ہیڈی اپنے دوست برائے ہر کے ساتھ ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھی اچانک وارد ہونے والے التباسات نے اس کی زندگی بدل ڈالی۔ اس کے تخلیقی مقاصد، اس کا طریقہ تخلیق، اس کے تخلیقی کام کی ٹھوس اشکال جو ازاں بعد ''ٹرالوجی'' اور ہیلن مصر میں'' کے بنیادی مواد کا مکاشفہ بنیں، اس پر اچانک نازل ہوئی تھیں۔ شدید، مستند، شفاف، مسلسل اور متحرک خیالات کی صورت میں، یکے بعد دیگرے ان تصویروں کے عقب میں ان کے منظرنامے ابھر رہے تھے۔ ایک تاریخی اور کائناتی معنویت کی سنجیدگی کے ساتھ، دن کو جاگتی آنکھوں دیکھے جانے والے خواب کی شکل میں، اس کے شعوری تمثیلات نے اگرچہ ابھی ظاہری طور پر کامل صورت اختیار نہیں کی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو ظاہر کر رہی تھیں اس دیوار پر جو اس کے بستر کے پائنتی اور غسل خانے کے درمیان واقع تھی۔ کسی دوپہر کا پچھلا حصہ تھا روشنیاں کسی حد تک مدھم ہو چکی تھیں۔ غسل خانے میں کچھ روشنی تھی۔ دیوار پر نمودار ہونے والی شکلیں کسی عکس کی نشاندہی نہیں کر رہی تھیں بلکہ وہ معمول کی وضاحت کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے حرکت پذیر تھیں جیسے انھیں ایک ہی ہاتھ نے کندہ کیا ہے بے ترتیب، قدیم اور روایتی تحریروں کی طرح لیکن مکمل حیاتی نظام کے ساتھ، گویا یہ کوئی نوشتۂ دیوار ہو اور اسے کبھی بھی پڑھنے اور چھونے کا تجربہ کیا جاسکے۔ اس طریق کار میں ایک اسرار چھپا تھا جسے کسی فارمولے میں نہیں ڈھالا جاسکتا لیکن دیوار سے ہیلڈا کے دماغ تک ایک سیدھا اور واضح راستہ تھا جسے پہلی بار اس نے مستقل ٹکٹکی باندھنے کی کیفیت سمجھا۔ انہماک کی اس شدت میں وہ پلکیں جھپکنے کے عمل سے گزرنے پر خوف زدہ ہوئی مبادا یہ منظر دھندلا جائے۔ اس نے اپنی داخلی بصیرت اور خارجی منظرنامے کے درمیان سعی کی کوشش جاری رکھی اور پھر اسی خیالی پیش رفت کی تائید میں برائے ہر کو بھی شامل کر لیا حالانکہ اس نے ابھی تک ہیلڈا کی یہ موجود دنیا اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی تھی۔ ہیلڈا نے پیش بینی کے عمل کو پیش گوئی میں تبدیل کیا اور پھر تمام عمر اسی بیان بازی سے فطری خاکوں میں رنگ بھرنے کا عمل جاری رکھا۔ سننے اور دیکھنے والوں کی فطری بصیرت اس درجے پر پہنچی:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہیلڈا نے اپنی سائیکی کے اس ''تصویرے'' کو مادی رنگ میں اس طرح بیان کیا کہ وہ دوسروں کے شعور کا حصہ بنتا چلا گیا لیکن اسی

حد تک جہاں تک اس کے قارئین اور سامعین و ناظرین کی بساط ہے، اسے یا اس کے قارئین کو یہ علم نہیں کہ تصویریں کہاں سے آئیں کیونکہ اس نے یہ معاملہ اپنے مضمون میں مبہم رکھا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اس کی یادداشت کا کمال ہو یا کوئی خوابیدہ کیفیت یا کچھ اور لیکن ہیلڈا اسے اندھیرے کمرے میں روشنیوں کے عقبی منظرنامے کا عکس جانتی ہے۔ اس کی لاشعوری دیویاں اور دیوتا اس کے سامنے تھے۔ تصویر ایک نظم، ایک خواب یا ایک خیال سے باہر نکل رہی تھی، کھلی ہوئی آنکھیں مزید روشنی سے نہائی ہوئی تھیں اور ہیلڈا کو یقین ہو چلا تھا کہ خدا انھی تصویروں کے ذریعے اہل زمین سے مخاطب ہوتا ہے۔ مکاشفے کا یہ تجربہ اندر کی دنیا کو باہر لاتا ہے کسی دوسری دنیا کے پیغامات کے ساتھ ہماری ہی شخصیت کی ایک اور نہج ..... گویا ایک اور طرح کی وجودیت تصورات، تحت الشعور، خاکہ نگاری، علامت اور اظہار کے معجزے آپس میں گڈمڈ ہو کر ہم آہنگی اور اتفاق پیدا کرتے ہیں جنھیں ہیلڈا اپنی مخصوص اصطلاح میں پروجیکشن (Projection) کہتی ہے۔ خودنمائی، اظہار، دریافت اور پھیلاؤ کے معانی پر غالب آتی ہوئی یہ اصطلاح ہر جسمانی اور ٹھوس حقیقت کو روحانیت کی اسی بگھی میں بٹھا دیتی ہے جسے تین غیر مرئی گھوڑے کھینچتے ہوئے جسم و روح کے کارزار سے بآسانی گزر جاتے ہیں۔ انسانی وجودیت وقت اور خلا کی وسعتوں کو اپنی موجودگی سے بھر دیتی ہے۔ ہیلڈا کی نظموں کے منظرنامے اسی نقرئی غبار سے اٹے ہوئے ہیں اور اس کی تصویریں اتنی شفاف، مدور اور گھستی ہوئی ہیں کہ سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ سب چیزیں ایک دوسرے میں مدغم، بکھری ہوئی، لگی ہوئی، چھڑکی ہوئی، کٹی پھٹی، لیکن توانائیوں سے بھرپور۔ اس کے کردار براہ راست خدا سے مخاطب ہیں اس یقین کے ساتھ کہ ان کے بلاوے پر وہ آئے گا، وہ ضرور آئے گا۔ تکرار کا یہ پھیلاؤ کشف والہام میں ڈھلتا ہے۔ ہیلڈا کی تحریر مراقبے کی صورت اختیار کرتی ہے اور یوں لگتا ہے پیغام کے ایک دنیا سے دوسری دنیا تک جانے آنے کا بہترین انتظام ہو گیا ہے۔ اظہار کے پھیلاؤ کا یہ سلسلہ جو لفظ پروجیکشن کا ایک وسیع استعارہ ہے، نقشہ نویسوں کی ماہرانہ صلاحیتوں کا ایک نمونہ بن جاتا ہے۔ ذہن کی خالی اور ہموار سطح پر لکیریں کھینچتا ہوا اور پھر اس کا وسیع منظرنامہ جورات، سمندر، آسمان یا ایسے ہی کسی وسیع لینڈ اسکیپ پر سانس لے رہا ہے، الہام کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ہیلڈا اس معاملے میں وژن آف برین (Vision of brain) اور وژن آف وومب (Vision of Womb) کی اصطلاح استعمال کرتی ہے اور اپنی کیفیات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس ذہنی تجربے اور دماغی انکشاف کو ایسا محسوس کرتی ہے جیسے اس کے سر پر ایک جیلی فش رکھ دی گئی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کی روحانی طاقت ایک نقطے پر جمع ہونے لگتی ہے۔ آخر کار یہ نقطہ چمکنے لگتا ہے شیشے کی گیند کی طرح بہت ہی لطیف اور دل افروز روشنی بکھیرتے ہوئے۔

یہ فانوس خیال جو کشاف دل و جاں ہے تمثیلی انکشافات کی دنیائے بسیط ہے جس کا تجزیہ کرتے ہوئے ہیڈی بتاتی ہے کہ کبھی اس نے ایک چھوٹا سا پروجیکٹر چلانا سیکھا تھا اور پھر اس نے اپنی زندگی کے سینکڑوں گھنٹے اسی پروجیکٹر کے ساتھ بسر کیے۔ یہ پروجیکٹر پول پروڈکشن کی ملکیت تھا اسے برائے ہر اور کینتھ چلایا کرتے تھے اس نے تھیٹر اور فلم کی زندگی کے کچھ سالوں میں اپنی جسمانی اور عقلی زندگی میں استعمال ہونے والے پروجیکٹر کو ذہنی پروجیکٹر کا پیش خیمہ سمجھا اور پھر وہ اپنے دماغ کو بھی پروجیکٹر کی طرح استعمال کرنے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ خوابوں، یادوں اور غیر متوقع تمناؤں کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ انھیں آگے

پیچھے کر کے دیکھا جا سکے جس طرح پردے یا سکرین پر انھیں ظاہر کیا جاتا ہے اور پھر پردے یا سکرین کی وہ حرکیت جو اسے ہوا کا ہلکورا یا منظر نامہ بدلنے والے کے ہاتھ عطا کرتے ہیں۔ وہ جذبہ یا خیال جو دروازے سے اندر آ رہا ہے، اسے بھی کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔ ہوا کی آمد و رفت اور دروازے کے معاملات بھی دور تک دکھائی دینے چاہئیں غلام گردشوں کے دکھائی دینے والے منظر کی آخری حد تک ..... ہماری یادداشت اور ہماری یادیں بھی تو ایک راستہ ہیں۔ دروازہ بند کر دیا گیا تو باقی کیا رہ جائے گا۔ بہتر ہے سب دروازے کھول دیں تا کہ ہم اپنے آپ کو دروازے سے باہر بھی دیکھ سکیں، لامحدود وسعتوں تک۔ دیر تک اور دور تک، یہی ہے تخلیق، سچی اور کھری ہوا کا لامتناہی جھونکا اور سنائی دیتا راستہ۔ ہیڈی نے ۱۹۳۳ء میں برائے ہر کے نام لکھے ہوئے ایک خط میں اپنے مکاشفے کی اسی فعالیت کے بارے میں مزید لکھا ہے۔

''فرائڈ کی یہ بات سن کر تو میں شرما گئی، جب اس نے کہا کہ تمہارے جیسے دماغ کی عورت سے میرا پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا، یہ ایک ایسا دماغ ہے جہاں خیال ٹھوس حقیقت بن کر خواب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک لطیف، شفاف، نفیس اور بہترین آئینے کی طرح ہر منظر نامہ بیان میں ڈھلتا ہے اور خیال ترسیل کے فرائض انجام دینے لگتا ہے''۔۔

فرائڈ ہیڈی کے اس خیالی ''تصویرے'' کو ایک خوبصورت تعمیر بلکہ کامل میتھالوجی قرار دیتا ہے بلکہ یہ سب علامتوں کی ایک ایسی دریافت ہے جسے لکھا جا سکتا ہے جس کا تجزیہ ہو سکتا ہے جس میں لکھنے والی خود شامل ہے اور اس کے اعادے کے عمل میں دوہری وجودیت کا راز پوشیدہ ہے۔

یہیں ہیلڈا کی حیثیت ایک بھٹکے ہوئے عارف کی سی ہے جو اپنے مسئلے کے اتار چڑھاؤ، آغاز و انجام اور مسلسل پیغام سے واقف ہے لیکن خیال کے گرداب سے ابھر کر ڈور کے اس سرے کو ہاتھ میں لینے سے قاصر ہے جس کی دوسری جانب تصاویر کے اصل خالق کی موجودگی کا اسرار پھیلا ہے اور فرائڈ ہیلڈا کے اس ان دیکھے جنگل میں ایک اجنبی سیاح کی طرح وارد ہوا ہے جو اس کے مکاشفوں کا ہاتھ تھامے اس کی تخلیق کردہ دنیا میں گھومتا پھرتا ہے۔ وہ کبھی ہیلڈا کا دوست بن جاتا ہے کبھی سامع، کبھی رفیق سفر، کبھی ناظر، کبھی حفاظت کرنے والا باپ اور کبھی خیال رکھنے والی ماں اور پھر وہ اپنے شعور کی روشنی میں بظاہر غیر شعوری طور پر ایسے مقام پر تھام کر روک لیتا ہے جہاں مکاشفے کی روشنی کا ارتکاز ممکن ہے اور جہاں ہیڈی اپنی باقی زندگی آخر کار ایک محدود خیال کے سوچے سمجھے نقشے میں دریافت شدہ تخلیق کے ساتھ بسر کر سکتی ہے۔ بقول ہیڈی:

"The most profound philosophy discloses the alchemist's secret."

ہیڈی نے اپنی ذات کے اسرار کو اپنے مکاشفے میں جس طرح دریافت کیا ہے اس قسم کی تجزیہ نگاری کے شخصی تجربوں کا تسلسل جاری رہنا چاہیے۔

# اردو کا شاہکار افسانہ: قید خانہ

ڈاکٹر محمد کامران

'قید خانہ' احمد علی کے اردو افسانوں کا آخری مجموعہ ہے۔ مذکورہ مجموعہ میں وہ ایک وقیع افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔

مذکورہ مجموعہ میں شامل طویل افسانوں میں سے 'قید خانہ' میں فلسفۂ حیات کے حوالے سے انسان کے تشخص کے بحران (Identity Crisis) کو اجاگر کیا گیا ہے۔ 'پریم کہانی' میں محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ 'قلعہ' میں تمثیلی انداز میں سیاست کو فلسفیانہ رنگ دیا گیا ہے۔ چوتھے اور آخری افسانہ گزرے دنوں کی یاد میں نوستجیائی شعور کی مدد سے ماضی کے پردوں میں چھپی پر اسرار اور حیران کن بازگشت سننے کی کوشش کی گئی ہے۔[1]

''قید خانہ'' کے افسانوں میں مصنف نے حیات و کائنات کے فلسفہ کی گہرائی میں اتر کر اظہار کے بہترین امکانات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقول ممتاز شیریں:

> ''احمد علی کا تصور آفاقی ہے اور ان کے یہ وقیع افسانے جو ہمارے ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، طویل کہانیوں کی ایسی مثالیں ہیں جو مغربی ادب کے بڑے افسانوں کے مقابل رکھی جا سکتی ہیں''۔[2]

مجموعہ میں شامل پہلے افسانہ ''قید خانہ'' کو رمزیت کے حوالہ سے ایک گہرا اور مکمل افسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ ممتاز شیریں کے خیال میں 'قید خانہ'، 'میرا کمرہ' اور 'موت سے پہلے' میں خاص طور پر کافکا کی رمزیت اور طریقہ اظہار سے مطابقت ملتی ہے، لیکن ان میں کافکا کے افسانوں سے نہیں بلکہ ناولوں The Trial اور The Castle سے مناسبت پائی جاتی ہے۔

ممتاز شیریں اس حوالے سے لکھتی ہیں:۔

> ''.....جدید رمزیت کا سرچشمہ کافکا ہی سے پھوٹا ہے کافکا میں ایک حقیقت نگار کے مشاہدے کی گہرائی اور باریک بینی بھی ہے اور ایک شاعر کی قوت تخیل بھی۔ وہ اشاریت کو ایک طرح کی الہامی بے خودی تک لے جاتا ہے جس میں تصورات ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری حقیقت سے دور ہوتے ہوئے بھی ان چیزوں کی اندرونی تہوں اور ان کی اصل فطرت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان میں ہمیں سطحی نہیں بلکہ عمیق گہرائی ملتی ہے''۔[3]

اسلوب احمد انصاری بھی ممتاز شیریں کے ہم خیال نظر آئے ہیں:

''قید خانہ میں جبریت کا احساس ایک حد تک کافکا کے دو مشہور ناولوں The Trial اور The Castle کی اچٹتی کی یاد دلاتا ہے، گو دائرہ کار یعنی Range کا فرق بہت اہم ہے۔ احمد علی کے افسانوں میں انسان حیرانی اور سرگردانی بلکہ سراسیمگی کا شکار نظر آتا ہے اور اس کی روح ایسے شکنجوں میں جکڑی نظر آتی ہے جس سے رہائی پانے کا کوئی امکان نہیں''۔ ۴

احمد علی مذکورہ مجموعہ میں شامل افسانوں کو تکنیک اور فلسفیانہ زاویہ نگاہ کی وجہ سے اہمیت دیتے ہیں۔ غالباً اسی لیے افسانہ کا باقاعدہ آغاز کرنے سے پہلے ایک ''نوٹ'' کے ذریعے کچھ اشارے دیے ہیں:

''اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ انسان صرف ایک مکان یا شہر یا ملک میں نہیں رہتا۔ زندگی بہت وسیع ہے اور خیالات کا سلسلہ ان تھک ہے..... تخیل کے لیے موت اور زیست یکساں ہیں..... مکان صرف رہائش کی جگہ نہیں بلکہ تخیل ہے..... ''قید خانہ'' کا مطلب اور فلسفہ افسانہ ہی میں موجود ہیں۔ یہ بے معنی افسانہ نہیں ہے اسی لیے شاید مشکل ہو''۔ ۵

مذکورہ افسانہ میں بہت سے مختلف واقعات مل کر ایک وحدت (Unity) میں ڈھل جاتے ہیں۔ مصنف نے اپنے تخیل کی مدد سے زمان و مکان کے فاصلے محو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مشرق ہو یا مغرب، انسانی جسم کے پنجرہ میں قید روح کا کرب ایک سا ہے۔ طاقتوروں نے ہمیشہ کمزوروں کا استحصال کیا ہے۔ تہذیبی و تمدنی ترقی نے جہاں کائناتی امکانات کے در وا کیے ہیں وہاں انسان مغائرت اور شناخت کے بحران کا اسیر ہو گیا ہے۔ انتظار حسین نے اس انسانی المیہ کا ذکر کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ دراصل وہی مذکورہ افسانہ کا مرکزی خیال بھی ہے:

''اب ہم ستم زدگان کا جہان اتنا تنگ ہے کہ آدمی اپنی جون میں مقید ہے۔ اس قید خانے سے اپنی مرضی سے باہر نکل سکتا ہے نہ کسی دوسرے کو اندر بلایا جا سکتا ہے۔ اب ہم اعداد و شمار کی دنیا میں رہتے ہیں۔ چیزوں کی حد بندیاں ہو گئی ہیں۔ ہمارے اردگرد تہذیب کی سرحد کھینچ گئی ہے''۔ ۶

لیکن انسان جن مصائب کا شکار ہے ان سے آگہی حاصل کرنے کے لیے اعداد و شمار اور حد بندیوں سے زیادہ دولت احساس کی ضرورت ہے:

''سڑک کے دونوں طرف مرد اور عورتیں چارپائیوں پر پڑے سو رہے ہیں۔ میری نگاہ ٹانگوں، چھاتیوں اور سوئے ہوئے چہروں پر پڑی۔ قسمت کے قیدی مرد اور عورتیں ساتھ سوتے، سڑک پر ہی بچے پیدا ہوتے اور انسان مر جاتے تھے''۔ ۷

مذکورہ افسانہ میں مصنف نے تقدیر کے جبر کے سامنے انسانی اختیار کے بارے میں جو سوال اٹھایا ہے اس کا حوالہ دیتے

ہوئے اسلوب احمد انصاری رقمطراز ہیں:۔

''ان کے احساس میں شدت بھی ہے اور ٹھہراؤ بھی اور ان سے بڑھ کر وہ کسک، چبھن اور دردمندی بھی جو کسی مظہر سے آنکھیں چار کرنے پر ان کے ہاں تشویش کا پہلو اختیار کر لیتی ہے، ان کے اہم ترین افسانوں کے مرکز میں جستجو کا وہ محرک نمایاں ہے جو انہیں حقیقت کا ادراک حاصل کرنے پر اکساتا ہے۔ انسان کا ذہن اور وہ پوری زندگی جو اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے، واقعی ایک قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

کیا انسان واقعتاً آزاد اور با اختیار ہے؟ کیا اس کی قوت ارادی اور اس کا حق انتخاب محض ایک واہمہ، التباس یا نخرہ پن تو نہیں ہے؟ کیا غم زیست اور غم دوراں ازلی اور ابدی حقیقت ہیں؟ اور کیا زمان و مکان کی بندشوں کو شکست دے کر نروان کا حصول ممکن ہے؟.....''۸

مذکورہ افسانہ کے پہلے دو مناظر میں ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات اور بنیادی حقوق سے محروم افراد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ تیسرے منظر میں یورپ کے کسی شراب خانے میں بڈسن نامی ایک اسی سالہ کڑوے مزاج کے عجیب و غریب شخص سے ملاقات ہوئی ہے جو کائناتی نظام کو بجلی کی کشش انگیز قوت کے تابع سمجھتا ہے۔ چوتھے منظر میں افسانے کا راوی خود کو اپنے مکان کا قیدی سمجھتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ اس دنیا سے دور اور بھی بہت سی دنیائیں اور ستاروں سے آگے نہ جانے کتنے جہان ہوں گے جہاں دلکشی، رعنائی اور آزادی ہوگی۔ یہاں مصنف کی سوچ کا رخ عصری صورت حال کی طرف ہو جاتا ہے۔ برصغیر کے باسیوں کی غلامی اور ذلت کا احساس احمد علی کی بہت سی کہانیوں میں اجاگر ہوا ہے۔ یہاں مصنف خود کو کسی پنجرے میں قید ریچھ کے روپ میں دیکھتا ہے۔ جسے آزادی کی خواہش بے چین رکھتی ہے۔ اس کی سفید چڑی والا آقا اس کا تمسخر اڑاتا ہے اور اسے آزادی کا خواب دکھا کر قیدی رہنے کے فوائد بتاتا ہے:

''ہر روز ایک شخص دور سے میرے پنجرے میں غذا رکھ دیتا ہے۔ وہ نزدیک آنے سے شاید اس لیے ڈرتا ہے کہ میں کہیں اس کا گلا نہ گھونٹ دوں.....اس نے جب پہلی بار مجھ سے شفقت سے باتیں کہیں تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ''کیسا ہے تو، ابے کالے غلام.....اگر میں تجھ کو آزاد کر دوں تو کیسا ہو؟''۔

میں خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا اور وجد سے چھاتی پیٹنے لگا:

''لیکن تو آزادی لے کر کرے گا کیا؟ میں تجھ کو کھانا دیتا ہوں، تیرا گھر صاف رکھتا ہوں۔ ذرا ان بندروں کو تو دیکھ.....ان کی زندگی وبال ہے''۔۹

مصنف اپنی انا کا اسیر ہے:

''مجھ پر کسی کا بھی جادو نہیں چل سکتا.....میرے لیے عورت محض ایک کھلونا ہے.....عورت ایک صیاد ہے اور مرد کی روح اور جسم دونوں پر قبضہ کرنا چاہتی ہے''۔۱۰

اس کے بعد مصنف اپنے مکان کے دائیں طرف واقع قبرستان کے وحشت ناک ماحول اور پشت پر موجود ایک ڈراؤنے اور بھیانک جنگل کی منظر کشی کرتا ہے۔ یہاں قبرستان، موت اور جنگل آزادی کی علامت محسوس کرتے ہیں اور یہ آزادی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہ سوچ اس کے لیے تکلیف دہ ہے کہ یہ جنگل بھی اس کے لیے 'قید خانہ' ثابت ہوا تو وہ کہاں جائے گا۔

مذکورہ افسانہ کے اگلے منظر میں مصنف نے اپنی تخیلی صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مکان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہی جون کے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی جو ۱۸۵۷ء میں مارا گیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جون نے گھٹنا ٹیک کر ایک ہندوستانی سپاہی کا نشانہ لیا تو سپاہی نے کہا تھا:

''قبلہ گورے، سنبھل کر، کہیں تمہاری گوری گوری ٹانگ میلی نہ ہو جائے''۔[۱۱]

کارلو کپولا، مذکورہ صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The episode with John, the soldier, is interesting as one such friendship which like that of Aziz and Fielding at the end of the Forster's A passage to India, can not "take" because of Johnirole as a soldier--or perhaps even an invader in India. The time sequence in this episode is also fascinating, for, on the one hand, John is transformed back into time to 1857, yet another part of him remains in same "present" as the general episode."[۱۲]

مصنف اپنے کمرہ میں داخل ہوتا ہے تو اپنی آرام کرسی پر میگی کو بیٹھے ہوئے دیکھتا ہے میگی چند برس پہلے ایک فضائی حادثہ میں ہلاک ہو چکی تھی، لیکن اس وقت بغیر ہونٹ ہلائے مصنف سے گفتگو کرتی ہے۔

احمد علی نے روحوں سے مکالمہ کرتے ہوئے کہانی کی فضا میں جس طرح تحیر اور اسرار کی کیفیت پیدا کی ہے، وہ جہاں مغربی افسانوی ادب کی تکنیکوں سے استفادہ کی کوشش ہے وہاں مصنف نے اپنی تخیلی صلاحیتوں کا بھی استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے بعض مقامات پر افسانہ کا علامتی نظام گنجلک ہو جانے کی وجہ سے ابلاغ کا عمل متاثر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''تخیل کے بارے میں احمد علی کی رائے پیش لفظ میں ملاحظہ کرنے کے بعد آپ تخیل کے جدید فکری وفنی تصور اور امکانات کے شیدائی کولرج کی نظمیں پڑھیں تو احمد علی کے اس افسانے کی لایعنیت اور دھند شعوری کاوش دکھائی دیتی ہے''۔[۱۳]

مذکورہ افسانہ کے آخری حصہ میں رمزیت اور تہہ داری کے ساتھ داستانوی اسرار کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مصنف کے

مکان کے سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر بنے مندر کے ساتویں کمرے میں پجاری کا لڑکا آنکھوں پر پٹی باندھے ایک پتھر کی حفاظت کر رہا ہے:

''جب بجلی کڑک کے پتھر پر گرے گی تو اس کے ہزار ٹکڑے ہو جائیں گے لیکن پجاری کا لڑکا ان کو سمیٹ کر اکٹھا کر لے گا اور وہ پھر جڑ جائیں گے''۔[۱۴]

ایک روز مصنف پہاڑ کے دامن میں واقع پن چکی کے قریب پہنچتا ہے۔ وہاں یہ دیکھتا ہے کہ سات کھیتوں میں دھان بویا جا رہا ہے۔ اس دوران ایک مرد چھ عورتوں سے مقابلہ کرتے ہوئے انہیں پانی اور کیچڑ میں غوطے دیتا ہے۔ اس دلچسپ رسم کے بعد وہاں موجود سب لوگ جشن مناتے ہیں۔ واپس پر گھر لوٹتے ہوئے مصنف لیلا سے ملنے چلا جاتا ہے۔ لیلا، عشق میں دیوانگی کی حدوں کو چھو لینا چاہتی تھی، مگر اس کا عشق حقائق سے فراریت سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ تب مصنف پر کھلا کہ لیلا اپنے خوابوں کی قید میں مبتلا ہے۔ افسانے کے آخری حصے میں اپنے مکان کی طرف لوٹتے ہوئے دیکھتا ہے کہ دو سپاہی ایک قیدی کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈالے لیے جا رہے ہیں اور سات مزدور قطار باندھے ہوئے سروں پر گیس کے ہنڈے رکھے گائے جا رہے ہیں۔ مذکورہ افسانے میں استحصالی رویے، ارضی حقائق کی تلخیاں، زندگی کی بھول بھلیاں اور پیچ در پیچ راہیں انسان کو درماندہ راہ اور مجبور محض ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ چنانچہ وہ رفتہ رفتہ اپنی ذات کے خول میں سمٹتا چلا جاتا ہے۔

اسلوب احمد انصاری اس حوالے سے لکھتے ہیں:۔

''احمد علی کے ہاں انسانی صورت حال کے روبرو ایک طرح کے تردد یعنی Angst کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ملتیں۔ وہ حقیقت کے خارجی مظاہرہ پر کوئی دو ٹوک واضح یعنی Explicit اور باہر سے عائد کیا ہوا تبصرہ نہیں کرتے بلکہ بیشتر ایک افسانوی Persona کی تخلیق کرتے ہیں اور اس کی وساطت سے تحیر، درماندگی اور اجنبیت کے احساس کو اجاگر کرتے ہیں جس سے انسان اس قید خانے میں دوچار ہوتا ہے جسے زندگی یا خارجی حقیقت کہہ لیجئے۔ ان کے کردار ایک طرح کی کشمکش کا شکار نظر آتے ہیں جو پیہم بھی ہے۔ اسے ناصبوری کی حالت میں بھی رکھتی ہے اور اس کی صلاحیتوں اور بیرونی مواقع اور صورت حال کے درمیان جو آویزش نظر آتی ہے اسے قابل فہم بنانے کی یہ Persona کوشش کرتا ہے لیکن وہ پھر بھی پوری طرح کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوتا''۔[۱۵]

مجموعی طور پر ''قید خانہ'' فنی اور تکنیکی اعتبار سے ایک منفرد انداز کا افسانہ ہے۔ مصنف نے مختلف خارجی اور داخلی واقعات اور محسوسات کے ذریعے انسان کی بے بضاعتی اور مغائرت کے احساس کو اجاگر کیا ہے۔ بعض مقامات پر مصنف نے تخیل کی مدد سے محیر العقول واقعات بھی پیش کیے ہیں جن میں میگی اور جون کی روحوں سے مکالمہ نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کے آخر میں سات کا ہندسہ اپنے اسرار کے باعث علامتی معنویت کا حامل نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

''قید خانہ'' قدرت کا جبر ضرور ہے مگر سات کا ہندسہ انسانیت کی آخری امید ہے اور یہی امید انسانی شعور کا ساتواں در کھول کر جسم کے مکان میں قید روح کو کرب واضطراب سے آزاد کر سکتی ہے۔ بقول ممتاز شیریں:

''قید خانہ میں احساس مجسم بن گیا ہے۔ اس افسانے کا کردار ایک حساس آدمی کا ذہن ہے۔ اس احساس کے زیر اثر نہ صرف ذہن سوچتا ہے اور آنکھ دیکھتی ہے بلکہ احساس جسم کے رگ وپے میں سرایت کر گیا ہے۔ ذہن، جسم وروح سب اس کرب، گھٹن اور قید میں جکڑے ہوئے ہیں''۔[۱۶]

## حواشی

۱۔ احمد علی نے قید خانہ کے پیش لفظ (ص ۱۰) میں بتایا ہے کہ اس مجموعے کے افسانوں میں پہلا فلسفہ حیات، دوسرا فلسفہ سیاست، تیسرا محبت اور چوتھا یاد سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ اصل ترتیب کے مطابق دوسرا افسانہ فلسفہ محبت اور تیسرا سیاسیات سے متعلق ہے۔

۲۔ ممتاز شیریں۔ معیار۔ لاہور: مکتبہ خیال، ص ۱۰۵

۳۔ محولہ بالا، ص ۱۰۶

۴۔ اسلوب احمد انصاری۔ ''حرفے چند'' (اداریہ) مشمولہ ششماہی نقد ونظر، علی گڑھ۔ جلد ۱۶۔ شمارہ ۱۔ ص ۵

۵۔ احمد علی۔ قید خانہ۔ دہلی: انشا پریس، ۱۹۴۴ء، ص ۱۳

۶۔ انتظار حسین۔ علامتوں کا زوال۔ نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۲

۷۔ احمد علی۔ حوالہ مذکور، ص ۱۵

۸۔ اسلوب احمد انصاری۔ حوالہ مذکور، ص ۳

۹۔ احمد علی۔ قید خانہ۔ ص ۲۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۹

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۲۔ Coppola, Carlo. "The short stories of Ahmed Ali". Studies of Urdu Ghazal and Prose Fiction ed. by M. Umar Memon, Madison University of Wisconsin, 1979. p.232

۱۳۔ انوار احمد۔ ڈاکٹر۔ اردو افسانہ۔ تحقیق وتنقید۔ ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۷

۱۴۔ احمد علی۔ حوالہ مذکور۔ ص ۳۸

۱۵۔ اسلوب احمد انصاری۔ حوالہ مذکور۔ ص ۳۰۳

۱۶۔ ممتاز شیریں ''اردو افسانے پر مغربی افسانے کا اثر''۔ مشمولہ اردو افسانہ۔ روایت اور مسائل۔ مرتبہ گوپی چند نارنگ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۷۸

# غالب کے تین فارسی مکاتیب۔ اردو ترجمہ

پرتو روھیلہ

پچھلے چند سالوں میں پرتو روھیلہ نے غالب کے وہ سارے خطوط کہ جو مختلف کتابوں میں پائے جاتے ہیں ترجمہ کر دیے ہیں۔ ان میں سے نامہ ہائے فارسی غالب، مآثر غالب، باغ دودر، پنج آہنگ کے خطوط باقاعدہ کتابی صورت میں طبع بھی ہو چکے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں ہم غالب کے ان تین پراگندہ خطوط کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو تا حال کتابی صورت میں نہیں پائے جاتے۔ یہ تینوں خطوط والی ٹونگ نواب وزیر محمد خان ملقب بہ وزیر الدولہ کو لکھے گئے ہیں۔ (ادارہ)

## بنام وزیر الدولہ وزیر محمد خان وائی ٹونک:

### ﴿خط ۱﴾

حمد و درود کے بعد نواب قدوسی القاب، عظیم الشان، رفیع المکان، ولی نعمت، آیہ رحمت، قبلہ دنیا و دین، حضرت امیر المومنین دام اقبالہٗ وزاد افضالہٗ کی درگاہ وافر السرور کے بار پانے والوں کی پیش گاہ میں عرض پرداز ہے کہ عریضہ نگار اگرچہ بظاہر قربت کی نظر گاہ کے دور افتادگاں میں سے ہے لیکن حقیقتاً آپ کی ہمیشہ قائم رہنے والی اقبال مہندی کے دامن سے وابستہ ہے (اور) اس قصیدہ سرائی کو جس کو جناب عالی کی خدمت مین شرف قبولیت ملا ہے اور جو (جناب کی) نظر معجز نما میں محمود قرائی پائی ہے۔ ذریعہ ثنا سائی تصور کرتا اور جناب کی محبت کے استحقاق اور الفت کی توقیر کی دعویٰ گاہ کی تعجب انگیز سند کا مالک ہے۔ ان ہی دنوں میں کہ جب خان صاحب مشفق و مہربان طالع بلند خان اور سعادت مند و اقبال آثار اصغر یار خان اسلام آباد ٹونک سے اس شہر آئے، تو انہوں نے مجھے اردو زبان میں لکھا ایک مسودہ دکھایا اور فرمایا کہ خداوند کی رضائے آسمان نسبت پر چاہتی ہے کہ یہ عبارت اردو سے فارسی میں منتقل کر دی جائے تا کہ ایک دل کش نسخہ تیار ہو جائے۔ چونکہ حق پرستی و حق گزاری (میرا) دستور اور خداوندان نعمت کے حقوق کی رعایت احکامات دین میں سے، مستقل اس فکر میں تھا کہ اگر موقع ملے تو کوئی خدمت بجالاؤں تا کہ جناب عالی کی نوازش اور بخشش کی اپنے حتی المقدور تلافی کر سکوں۔ چونکہ حسن اتفاق کی برکات سے یہ تقریب سعید نکل آئی ہے (اس لیے) اتمام کار اور آرائش گفتار کی جرات کی۔ اور وہ تمجید و توصیف کہ جو میرے قلب میں پوشیدہ تھی اس تحریر کے ضمن میں آپ کی خدمت میں پیش کی۔ ہر چیز کہ یہ ایک مایہ قلیل اور ہدیہ حقیر ہے لیکن جب یہ سننے میں آتا ہے کہ خلیفہ نے ایک عرب بدو سے کھاری پانی بطور تحفہ قبول کیا، اور حضرت سلیمان نے چیونٹی سے ایک ٹڈی کا پیر، (تو) اپنے دل کو قبولیت کی خوش خبری سے خوش کر

لیتا ہوں۔ خالق میری زبان کو بیخی سے محفوظ رکھے اور حق سے امیدوار ہوں کہ سوائے حق کے میرے دل میں کچھ نہ آئے۔ حق تو یہ ہے کہ جب جناب کی تعریفیں مشفقی طالع یار خان سے خصوصاً اور دوسروں سے عموماً سنا کرتا ہوں اور اس محبت کے مشاہدے سے بھی کہ جو میرے ضمن میں ظہور پذیر ہوئی ہے تو افسوس کرتا ہوں کہ جب لارڈ الن برا کے عہد فرمان روائی میں اطراف شہر دہلی آپ آپ کے جاہ وجلال کے شامیانوں کا مرکز تھا تو اس بدبخت کو قدم بوسی کی توفیق نہیں ہوئی۔ اب یہ خیال ہے کہ اگر موت نے مہلت دی اور تاب وتوانائی نے ساتھ دیا تو اس شہر سے ہجرت کی نیت سے نقل مکانی کر کے اپنی مٹھی بھر ہڈیوں کو اس درگاہ میں کہ جو درویشان بےنوا کی امیدوں کا مرکز ہے پہنچاؤں اور باقی عمر حضرت امیر المومنین کے حضور میں گزار دوں۔

خدا کرے دولت واقبال کا آفتاب فروغ جاودانی کا سرچشمہ ہے۔ عرض داشت اسد اللہ۔ محررہ چوتھی ذی الحجہ ۱۲۶۴ھ۔

## خط ۲

خیر خواہ اسد اللہ کی عرض داشت خزانہ فیض، جناب مستطاب، ہمایوں خطاب، قبلہ دنیا و دیں حضرت امیر المومنین دام اقبالہٗ کی خدمت میں اس توصیف کی بنا پر کہ جو مرید بجالا سکتے ہیں اور اس قدر تعریف کے ضمن میں کہ جو شاعروں کے تخیل میں آ سکتی ہے، بے شک میں نے خود کو اس دولت جاوید طراز کے دامن سے وابستہ کر رکھا ہے اور وہ اس سبب کہ کسی دوسرے کام کا اہل نہیں اور کوئی عمدہ خدمت انجام نہیں دے سکتا اس لیے ثناخوانی اور دعا گوئی پر قناعت کر کے اس کا التزام کیا ہے کہ ہر سال عید الضحیٰ کی تہنیت کی تقریب پر ایک تحریر توصیفی میری طرف سے جناب کی نگاہ التفات سے روشناس ہوتی رہے۔ چنانچہ گزشتہ سال میں نے ایک قصیدہ کہ جس میں بہت اہم یہ ہے:

صورت معنی اسلام وزیر الدولہ　　　که دلش آئینہ صورت ایماں آمد

روانہ کیا ہے اور اس سال یہ قطعہ بھیج رہا ہوں۔ زیادہ حد ادب۔ خدایا آفتاب اقبال آب وتاب میں آفتاب جہاں تاب کا ہم سنگ ہو۔ محررہ بیسویں ذی قعدہ ۱۲۶۹ھ

### قطعہ تہنیت

۱ اے کہ بر نام تو صدرہ جم وقیصر صد بار　　　عرصہ دربارۂ کم ساختن باج نوشت

اے کہ تیرے نام پر جم وقیصر نے سیکڑوں بار درخواست بھیجی ہے کہ ان کا خراج کم کر دیا جائے۔

۲ در کف فیض قلم را علم فتح شمرد　　　برسرت بخت کلہ را گہریں تاج نوشت

تیرے ہاتھ میں فیض نے قلم کو فتح کا علم تصور کیا (اور) خوش بختی نے تیرے سر پر ٹوپی کو موتیوں کا تاج قرار دیا۔

۳ خم ابروئے ترا، چرخ مہ نو دانست　　　روز بد خواہ ترا دہر شب داج نوشت

تیرے خم ابرو کو آسمان نے ماہ نو جانا، (اور) تیرے بدخواہ کے دن کو بھی زمانے نے شب تار یک قرار دیا

۴ آں دقائق کو بہد در گرو سہم الغیب　　　قلم تیر تو بر صفحہ آماج نوشت

وہ اسرار کہ جو غیبی تیروں میں چھپے ہوتے ہیں (ان کو) تیرے تیر کے قلم نے چاند ماری کے قرطاس پر لکھ دیا۔

۵۔ تو نہ رفتی و بنام تو خداوند کریم رقم قافلہ سالاریٔ حجاج نوشت

اگرچہ تو نہیں گیا لیکن خداوند کریم نے حجاج کی قافلہ سالاری تیرے نام لکھ دی۔

۶۔ کاتب دہر بسرمایہ عمر تو فزود ہر چہ درزائچہ خضر بہ سہلاج نوشت

کاتب وقت نے وہ تیری عمر کے سرمایہ میں جوڑ دیا جو کچھ بھی کہ حضر کے زائچہ عمر میں لکھا گیا تھا۔

۷۔ باد فرخندہ و فرخ بتو عیدالاضحیٰ دانگہ ایں قطعہ کہ ایں بندہ محتاج نوشت

تجھے تھے عہد قرباں مبارک وسلامت ہو اور اس کے ساتھ ہی یہ قطعہ بھی حواس بندہ محتاج نے لکھا۔

## خط ۳

خیر خواہ اسداللہ کی عرضداشت مکرمت ظہور، جناب مستطاب نواب صاحب دونوں جمال کے قبلہ وکعبہ فیض کے سمندر اور احسان کے دریا کے حضور میں

بے شک چونکہ عریضہ نگار کا مقصد ہر قسم کی نظم ونثر سے سوائے تمجید وتوصیف کے اور کچھ نہیں خدایا وہ روز دل افروز بھی دکھا کہ (میری) آنکھیں اس عرش آسا کف پا سے روشناس ہو جائیں اور قلم کا کام زبان سے لیا جائے۔ اگر وقت نے مساعدت اسباب سے دریغ نہ کیا تو ان جاڑوں میں کعبہ مقصود کے طواف کا احرام باندھوں گا یعنی (آپ کی) آستان نشینی کی زحمت دوں گا۔ مرحومی میر تفضل حسین خان کو کہاں سے لاؤں کہ میرے عبودیت نامے کو بھی اپنی نظر انور سے گزاریں اور (جناب کے) فرمان کرامت اور پروانہ خوشنودی بھی مجھ کو پہنچائیں۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک میں خود خدمت بخشتہ میں نہیں پہنچوں گا میرا کام بقدر باعیت روا نہیں ہوگا۔ اس بار مجموعہ عقل وانصاف شیخ اللہ داد کی زبانی بھی کچھ گزارش کی ہے امید ہے کہ گوش باہوش میں پہنچا دی جائے گی۔ زیادہ حد ادب۔ دولت واقبال کی بہار جاوداں اور جاہ وجلال کا بہارستان بے خزاں رہے۔ محررہ یکم محرم ۱۲۷۱ھ

الحمدللہ کہ یہ ترجمہ آج ۲۷ مئی ۲۰۰۱ء بروز اتوار مسقط میں اختتام پذیر ہوا۔

## توضیحات

نواب وزیرالدولہ کے نام تین خطوط اور ایک فارسی قطعۂ تہنیت

''مرزا غالب اپنی معاشی ضرورت سے والیان ریاست کے درباروں میں رسائی کے لیے برابر کوشش کرتے رہتے تھے اور اپنے احباب کے جو مقربین بارگاہ ہوتے، توسط سے اپنی معروضات اور مدحیہ اشعار بھیجتے رہتے تھے۔ انہوں نے اجستھان کی ریاست ٹونک سے بھی تعلق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ نواب امیر خان کے بعد جب ۱۸۳۲ء میں نواب وزیر محمد خان ریاست کے مسند نشین ہوئے اور ان کو مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی نے بھی ایک شاہی فرمان کی رو سے ''نواب وزیرالدولہ کا خطاب عطا کیا تو غالب نے ان سے ربط پیدا کرنا چاہا۔ یہ ایک علم دوست فرماں روا تھے۔ مومن خان مومن نے بھی ان کی مدح میں اشعار کہے تھے۔

غالب نے ۱۸۴۶ء سے پہلے کسی وقت میر تفضل حسین خان کی معرفت ایک قصیدہ تہنیت عرفی شیرازی کی زمین میں (اے ذات تو جامع صفت عدل وکرم را اے برشرف ذات تو اجماع امم را) بھیجا تھا۔ پھر عیدالضحیٰ کے موقعے پر سالانہ قصیدہ تہنیت بھیجنے لگے۔ نواب وزیرالدولہ وزیر محمد خان نے ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا اور ان کے بیٹے نواب محمد علی خان مسند آرا ہوئے۔ محمد

علی خان بہت اولوالعزم اور جیالے فرمانروا تھے۔ انگریزوں کو خوف ہوا کہ نواب امیر خان کی طرح یہ بھی میدان کارزار گرم نہ کر دیں۔ اس لیے انہیں ایک قتل کے مقدمے میں ملوث کر کے معزول کر دیا اور جلاوطن کر کے بنارس بھیج دیا۔ ریاست ان کے بیٹے نواب ابراہیم علی خان کو دے دی۔ نواب محمد علی خان باقی عمر بنارس ہی میں رہے اور زندگی علمی مشاغل میں بسر کی۔ کتب خانہ سعیدیہ ٹونک جواب تین حصوں میں بٹ چکا ہے۔ مخطوطات کا ایک حصہ نیشنل میوزیم نئی دہلی میں، اور دوسرا ٹونک کے عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اور مطبوعات کا ذخیرہ سعیدیہ ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک میں پایا جاتا ہے۔ یہ ذخیرۂ کتب زیادہ تر نواب محمد علی خان ہی نے بنارس میں اپنے قیام کے دوران جمع کیا تھا۔ یہاں مرزا غالب کے تین غیر مطبوعہ فارسی خطوط کا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تینوں خطوط نواب وزیرالدولہ کے نام ہیں۔ ایک قطعۂ تہنیت فارسی میں بھی ہے جو انہوں نے عیدالاضحیٰ کی مبارکباد کے طور پر بھیجا تھا۔ یہ سب ریاست ٹونک کے خشی خانے میں محفوظ تھے جواب اسٹیٹ آرکاؤز میں ختم ہو چکا ہے۔ مجھے ان خطوط کے عکس مولانا محمد عمران خان صاحب ٹونکی مرحوم کی عنایت سے دستیاب ہوئے تھے۔ ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

**تلاش غالب از نثار احمد فاروقی غالب انسٹی ٹیوٹ دھلی، ۱۹۹۹ء**

# بال جبریل، غزل ۳: ایک تشریح

ڈاکٹر صدیق جاوید

بال جبریل، غزلیات حصہ اول کی تیسری غزل میں محبوب سے خطاب ہے۔ غزل کے خطابیہ اشعار میں عموماً عشق اور جوش محبت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اس غزل میں غزلیت بھرپور انداز میں پائی جاتی ہے گویا اس غزل کے اشعار کے الفاظ اردو فارسی غزل کے مخصوص اور مانوس الفاظ ہیں جو ایما اور رمز و کنایہ کی کیفیت کے حامل ہیں اور ان سے مجازی عشق جھلکتا ہے۔ مگر اس غزل کے آخری دو شعر غیر محسوس طور پر آہستہ سے یوں سامنے آتے ہیں کہ پہلے چار شعروں کو بھی اپنے حصار میں لے لیتے ہیں کہ پوری غزل میں خدا سے خطاب اور عشق حقیقی کے اظہار کے علاوہ شاعر کا کوئی دوسرا منشا و مدعا دکھائی نہیں دیتا۔ اس تمہید کے بعد سادہ انداز میں غزل کی تشریح ملاحظہ فرمایئے۔

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

## الفاظ و معانی:

گیسو: زلف، کاکل / تاب دار: چمک دار (بمعنی خوبصورت)۔ خم دار: پیچ دار (گھنگھریالے) / اور بھی، پہلے سے زیادہ۔ خرد: عقل / قلب: دل۔ / شکار کرنا: پھندے میں پھنسانا۔ لوٹ لینا: مطیع کرنا، مغلوب کرنا۔

## تشریح:

انسانی حسن و جمال کے مجموعی تاثر اور تاثیر میں خوبصورت زلفوں کا نمایاں حصہ ہے خصوصاً محبوب کی زلفیں جس کا ایک بڑا مظہر خیال کی جاتی ہیں جو عاشق کے جذبہ محبت کو ابھارتی ہیں۔ دلکش زلفوں کی متعدد خصوصیات ہیں۔ مگر زلفوں کا گھنگھریالا اور خم دار ہونا اضافی حسن کی دلیل ہے۔ شاعر یعنی عاشق کو محبوب کی چمکتی ہوئی (سیاہ) پیچ دار یعنی گھنگھریالی زلفیں اپنا فریفتہ کر لیتی ہیں گویا اپنی پیچیدگی میں الجھا لیتی ہیں۔ عاشق کو محبوب سے زیادہ سے زیادہ وابستگی کی تمنا ہوتی ہے۔ اس کی عاشقی امنگ کرتی ہے کہ محبوب کے حسن و ناز میں اضافہ ہو لہٰذا وہ محبوب کو پہلے سے بڑھ کر اپنی زلفیں بنانے، سنوارنے اور سجانے کے لیے کہتا ہے تاکہ اس کی زلفوں کی دلکشی اور تابانی عاشق کے حواس اور اس کی دانش مندی کو لوٹ لے اور اس کی زلفوں کا پیچ و خم اس کے دل و نظر کو اپنے پھندے میں پھنسا لے یعنی عاشق کی نظر محبوب کے حسن میں پیوست (ڈوبی) رہے اور اس کا دل حسن کی کیفیات سے پیدا ہونے والی عاشقانہ واردات کی آماجگاہ بنا رہے کیونکہ ہوش و خرد اور عقل و دانش جذبہ عشق کو دبانے اور عاشق کو نفع و نقصان سمجھانے کے منصب دار ہوتے ہیں اس لیے ایک عاشق

عاشق کی انتہائی خواہش محبوب کا وصل تو ہوتی ہی ہے۔ عشق حقیقی میں بھی انتہائے شوق یہی ہے کہ عاشق محبوب حقیقی سے متحد اور پیوست ہو جائے۔ عشق حقیقی کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ عاشق، محبوب حقیقی میں یوں جذب ہونے کو اپنے عشق کی معراج سمجھتا ہے کہ اس کی ذات نیست و نابود ہو جائے۔ واردات روحانی بھی اقبال کا ذاتی تجربہ رہا ہے۔ یہ شعر اقبال کے عشق حقیقی کا آئینہ دار ہے۔ یہ عام طور پر معلوم بات ہے کہ ندیاں اور دریا سمندر میں گر کر بے شناخت ہو جاتے ہیں اور سمندر ہی بن جاتے ہیں۔ اقبال نے خدا کو مخاطب کرتے ہوئے اسے استعاراتی طور پر سمندر کہا ہے اور اپنے آپ کو ایک ندی، وہ جو چھوٹی سی ہو، قرار دیا ہے۔ شاعر خدا سے اپنی تمنا کا اظہار کرتا ہے کہ تو مجھے اپنی ذات میں (جو سمندر کی طرح بے حد و بے کنارہ ہے) شامل کر لے اور مجھے اپنی طرح بیکراں کر دے۔ مجھے اپنی ذات میں یوں جذب اور مدغم کر لے کہ میری حقیر اور بے مایہ ہستی تیری ذات میں شامل ہو کر بے کنار اور بے حصار ہو جائے۔

اقبال کے عمرانی فلسفہ کے حوالے سے اس مفہوم کی گنجائش ہے کہ ملت بیضا میں چھوٹی چھوٹی قومیتیں اپنی اپنی شناخت ختم کر کے شامل ہو جائیں تو ملتِ اسلامیہ شوکت و عظمت کی حامل ہو سکتی ہے۔

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہر شاہوار کر

لغت:

آبرو (آب: چمک، رو: چہرہ) عزت، قدر و منزلت / خزف: ٹھیکری، حقیر / شاہوار: بادشاہوں کے لائق، نہایت قیمتی / گوہر شاہوار: بہت قیمتی موتی

تشریح:

اس شعر میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ انسان ہر حالت اور حیثیت میں خدا کی عنایات کا محتاج ہوتا ہے۔

سیپی کی قدر اور اہمیت اس وجہ سے ہے کہ قطرہ اس کی کوکھ میں پرورش پا کر موتی بنتا ہے۔ یہ قدرت کو اختیار ہے کہ وہ موتی کی پرورش کس طرح کرتی ہے۔ اسے عام سا موتی بناتی ہے یا اسے قیمتی اور پر شوکت موتی کی حیثیت عطا کرتی ہے۔ اقبال کہتا ہے: اے خدا اگر میں ایک عام سیپی ہوں تو اس سیپی میں پرورش پانے والے موتی کی دیکھ بھال اور پرداخت تیرے اختیار میں ہے۔ اسی طرح اے خدا مجھے عزت بخشنا، قدر و منزلت عطا کرنا اور میری صلاحیتوں کو نکھارنا تیری قدرت کا کرشمہ ہے۔ اور اگر میں ٹھیکری کی طرح حقیر اور بے مایہ ہوں تو یہ بھی تیرے اختیار میں ہے کہ مجھے اپنی عنایات کے طفیل بادشاہوں کے دل پسند موتی کی طرح قیمتی اور گراں مایہ بنا دے۔

خدا کی بے نیازی دن رات کا عام مشاہدہ ہے کہ وہ طبقہ اور حیثیت کے امتیاز کے بغیر بعض آدمیوں کو ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت کرتا ہے کہ وہ دولت، امارت، قیادت، حکومت اور شہرت کے حقدار بن جاتے ہیں اور مناصب جلیلہ پر فائز ہوتے ہیں اور

ملک وقوم کے منتخب افراد قرار پاتے ہیں اور اس طرح اکثر گلیوں میں ٹھیکریوں اور روڑوں کی طرح رلنے والے بھی بلند مراتب پاتے ہیں اور اعلیٰ مجالس کے سزاوار قرار پاتے ہیں۔

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

لغت:

نغمہ: گیت، ترانہ/نو بہار: نئی اور تازہ بہار/دم: سانس/نیم سوز، آدھا جلا ہوا/دم نیم سوز: اپنی شاعری کی طرف اشارہ ہے جو ابھی اثر پذیر نہیں ہوئی/ طائرک: چھوٹا پرندہ یا جس کا اظہار ابھی نامکمل ہے جس میں رچاؤ گھلاوٹ اور پختگی نہیں آئی۔
طائرک بہار: بھرپور بہار سے پہلے، شروع موسم میں آنے والا چھوٹا پرندہ جو بھری بہار کے پرندے (بلبل) کی طرح full throated نہیں ہوتا۔

تشریح:

اس شعر کی پہلی یعنی لفظی سطح پر تو مطلب واضح ہے مگر اس کی دوسری تیسری سطح پر مرادی معنوں تک پہنچنے کے لیے وضاحت کی ضرورت ہے۔

ایک خزاں کے بعد جب تازہ بہار آتی ہے تو نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ پھولوں کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ نوعمر پرندے اپنی نحیف آواز کے ساتھ گلشن میں آ جاتے ہیں۔ اصول فطرت کے مطابق آہستہ آہستہ بہار جوبن پر آنا شروع ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جوشِ فصل گل عجب سماں پیدا کر دیتا ہے۔ رنگ، خوشبو اور نغموں سے سارا چمن معمور ہو جاتا ہے ہر طرف خوشی اور شادمانی کی فضا چھا جاتی ہے۔ شعر کی تفہیم کے لیے اس فضا کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

شاعر کہتا ہے اگر نئی فصل گل (بہار) میں گائے گئے پرسوز گیت (عمدہ گیت کی خصوصیت) میری قسمت میں نہیں ہیں تو اے خدا مجھے ابتدائے بہار میں نغمہ آغاز کرنے والا (چھوٹا) پرندہ ہی بنا دے۔ طائرکِ بہار کے حوالہ سے یہ نکتہ سوجھتا ہے کہ اگر تازہ اور بھرپور بہار میں گیت گانا میرے نصیب میں نہیں یعنی میں بہار کے عروج تک اس کے گیت گانے کے لیے زندہ نہیں رہتا تو مجھے تو شروع بہار میں نغمہ آغاز کرنے کی مہلت دے یا موقع عطا کر۔

اس شعر کو اقبال کے خطبہ الہ آباد (۱۹۳۰ء)، گول میز کانفرنسوں کی ناکامی مگر آزادی ہند کے امکانات اور اقبال کی بگڑتی ہوئی صحت کے اس پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ خطبہ الہ آباد میں اقبال نے ہندوستان کے اندر مسلم اسٹیٹ کا قیام اور اس کی حدود واضح کی تھیں۔ اقبال کو اپنے آخری برسوں میں وجدانی طور پر ملک میں متوقع آزادی اور شادمانی کی فضا چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ لہٰذا اقبال خدا سے کہتے ہیں اگر آزادی کی شادمانی میری قسمت میں نہیں تو میری شاعری اور افکار کو آمدہ آزادی کا نقیب بنا دے۔

باغ بہشت میں مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

لغت:

باغ بہشت: جنت کا وہ باغ جہاں حضرت آدم نے ممنوعہ پھل چکھا تھا/کار جہاں: دنیا کا کاروبار یعنی کام/دراز: لمبا، وقت طلب۔

تشریح:

اقبال کو قرآنی قصہ ہبوط آدم یعنی اس کا جنت سے زمین پر اترنا اور اس کے متعلقہ مسائل مثلاً ابلیس کا آدم کو سجدہ سے انکار وغیرہ سے بہت دلچسپی ہے۔ اقبال زمانہ طالب علمی میں مشہور انگریزی شاعر ملٹن کی Paradise Lost اور Paradise Reganied سے بہت متاثر بھی تھے۔ اقبال کی نظم ونثر میں اس قصہ کے مختلف پہلو مختلف حوالوں سے بار بار آتے ہیں۔

اس شعر میں اقبال خدا سے سوال کرتا ہے کہ جب تو نے حضرت آدم کو اپنے گناہ (پھل چکھنا) پر عفو ودرگزر کا خواستگار ہونے پر معاف کر دیا تھا تو بات ختم ہو گئی تھی مگر تو نے اس کے باوجود اسے جنت سے نکل کر زمین کا سفر اختیار کرنے کا حکم دیا اور اسے خلیفۃ الارض کا منصب عطا کیا اور ایک معین مدت تک زمین پر قیام اور حق عبودیت ادا کرنے کا حکم دیا۔

یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ آدم نے جنت میں دائم آباد رہنے کے لالچ میں ہی تو ممنوعہ پھل چکھنے کا گناہ کیا تھا اور معینہ مدت کے بعد جنت میں واپسی کے وعدے پر ہی اسے زمین پر بھیجا گیا تھا، وہی جنت اس کا مقصود ہے۔ اقبال اولاد آدم کے ترجمان کی حیثیت میں محسوس کرتا ہے کہ انسان کے لیے جہان ارضی میں قیام کی معین مدت ختم ہو گئی ہے اس لیے خدا کو اس کی واپسی کا انتظار ہے۔ وہ انسان کی ترجمانی کرتے ہوئے خدا سے کہتا ہے کہ ابھی اس (انسان) کے کام ادھورے ہیں اور اب اسے دنیا کے کاموں کو سمیٹنے اور ان کی تکمیل کے لیے جو مہلت درکار ہے وہ اس لیے مختصر ہے کہ دنیا میں اس کے کاموں کا سلسلہ بہت پھیلا ہوا ہے۔

اقبال نے اس شعر میں یہ انسانی قدر بھی دریافت کی ہے کہ مزاحم سے نبرد آزما ہونا تو انسان کی فطرت ہے ہی مگر وہ اپنے آزادانہ فیصلوں کے لیے اپنے خالق کو بھی چیلنج کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ آدم کا ارادہ اور خود مختاری ایسی چیز ہے کہ وہ خدا کو بھی مخل نہیں ہونے دیتا۔ انسان میں آزادی کا احساس ارادے کا جوہر ہے کہ وہ خدا کو بھی چیلنج کرتا ہے۔ اقبال بہ حیثیت انسان اللہ تعالیٰ کو باور کراتا ہے کہ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ اس نے مجھے زمین کے سفر پر نکلنے کا حکم تو دے دیا مگر یہ سفر کتنا طولانی ہے اور کب ختم ہو گا۔ یہ کیوں نہ سوچا؟ اور مجھے خلیفۃ الارض بنا کر جو ذمہ داریاں سونپی تھیں اور جن کو نبھانے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ ان سے عہدہ برا ہونا میری اولین ترجیح ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو ایجاد کی لذت اور دریافت کی فطرت ودیعت کر دی ہے۔ نیز اولاد آدم کی خلافت ارضی سے تسخیر کائنات مشروط کر دی ہے، اس انسانی فطرت اور سرگرمی سے انسان کا کار جہاں دراز ہوتا جا رہا ہے اور اس کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ لہٰذا اب خدا کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ انسان کو مکمل طور پر فطرت کی تسخیر کی مہلت دے اور اس کی واپسی کا انتظار کرے۔

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

**لغت:**

روزِ حساب: جزا کا دن، قیامت کا دن جب حساب ہوگا / دفترِ عمل: اعمال نامہ، عمل کا روزنامچہ

**تشریح:**

اقبال کا یہ شعر اتنا سہل اور سادہ ہے کہ اس میں نہ کوئی لفظی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی معنوی اشکال ہی ہے۔ اگر ایسے ہی اشعار کے بارے میں پیشہ ور شارحین کہتے تھے کہ شعر صاف ہے اور مطلب واضح ہے تو درست ہی کہتے تھے۔ اگر چہ یہ بات اس شعر پر بھی منطبق ہوتی ہے مگر کچھ شرح کے قارئین ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لیے ایک آدھ تشریحی اشارہ نفسیاتی ضرورت ہوتا ہے۔

اس شعر میں مضمون صرف اس قدر ہے کہ شاعر خدا سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ قیامت کے دن جزا سزا کے لیے جب میرا نامۂ اعمال پیش ہوگا تو اس کے پیش نظر اے خدا! جب تو مجھ سے استفسار کرے گا کہ کیا تو نے دیکھ لیا ہے اپنا نامۂ اعمال؟ یعنی مجھے میرے اعمال دکھا کر میرے احساس جرم (گناہ) کو ابھارے گا اور میرے ضمیر کو کچوکے لگا کر مجھے شرمسار کرے گا۔ کسی کو اس کا نامۂ اعمال دکھانا اور اس کی وجہ سے اسے شرمسار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کا نامۂ اعمال اس کی بداعمالیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس بندے کا اعمال نامہ اس کی بداعمالیوں کے بجائے محض اس کی بے عملی سے عبارت ہے تو یہ بھی کوئی کم شرمساری کی بات نہیں گویا یہ صورت حال تو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ بندہ خدا اپنے فرائض کی بجا آوری سے عہدہ برا نہیں ہوا۔ یعنی حسن عمل کا فقدان اپنی جگہ خواری اور شرمساری کا باعث ہے۔

چلیے! بندہ خدا تو اپنی بداعمالی یا بے عملی کی بنا پر پشیمانی اور شرمساری سے دوچار ہوگا مگر سوال پیدا ہوتا ہے: محتسب یعنی خدا جو روز جزا بندوں کے اعمال کا حساب کرے گا وہ کس بات پر اور کیوں شرمسار ہوگا۔ یہاں لفظ بھی کی تکرار بھی معنی خیز ہے۔ اس سلسلے میں شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ بداعمالی یا بے عملی کا ذمہ دار انسان، تخلیق تو خدا کی ہے جسے اس نے اپنا نائب اور خلیفۃ الارض بنا کر بھیجا تھا۔ کیا اسے اپنی مخلوق کی فطرت کا اندازہ نہ تھا۔ بے شک زمین پر انسان نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی تھی لیکن اسے یہ منصب تو خدا نے عطا کیا تھا۔ بہر حال مجموعی نتیجہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اور یوں اس کا اعمال نامہ منفی حیثیت کا حامل ہے۔

یہ شعر اقبال کے اساسی فکر سے وابستہ ہے جس میں فرد اور قوم کے تساہل اور بے عملی کو قومی زندگی کے انحطاط اور زوال کا سبب بتایا گیا ہے۔ اقبال نے اس شعر میں قوم کے اخلاقی رویے اور افراد کے مذہبی اعمال پر ایسی لطیف مگر بالواسطہ طنزیہ تنقید کی ہے کہ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

# سرعبدالقادر اور اردو ہندی نزاع

محمد حنیف شاہد

اردو ہندی نزاع کے بارے میں اردو اور انگریزی میں بہت سا مواد سامنے آ چکا ہے۔ اس موضوع پر بعض مستقل کتابیں بھی دستیاب ہیں لیکن مندرجہ ذیل مقالے میں کچھ نئی معلومات اور حوالے پہلی بار پیش کیے جا رہے ہیں۔ (مدیر)

جب سے انگریزوں نے برصغیر کی حکومت سنبھالی تھی اسی وقت سے مسلمان ان کی نظروں میں معتوب تھے۔ انگریز مسلمان حکمرانوں کی ہر یادگار کو مسخ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اردو زبان کا ڈھانچہ اگرچہ ہندی الاصل تھا مگر ہندو اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے اسی لیے اس زبان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت سے ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۹۷ء تک مختلف اوقات میں بے شمار موقعوں پر اردو کو تہ تیغ کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔ ۱۸۹۸ء میں ہندی زبان کے ہندو حامیوں نے بے شمار دستخطوں کے ساتھ ایک محضر نامے کے ذریعے سر اینٹونی میکڈانل لیفٹننٹ گورنر یوپی سے مطالبہ کیا کہ عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی کو رائج کیا جائے۔ اس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو یوپی کی عدالتوں میں ہندی دیوناگری رسم الخط جاری کر دیا جس کا اصل مفہوم ہندی زبان تھا۔

نواب سید مہدی علی خاں محسن الملک (۱۸۳۷ء۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء) علی گڑھ ٹرسٹ کے سیکرٹری اور سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) کے جانشین نے اس نئے اقدام کا جواب دینے کے لیے ۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ ٹاؤن ہال میں ایک کامیاب جلسہ عام میں سر اینٹونی میکڈانل کے ان اقدامات کی نہ صرف شدید مذمت کی بلکہ ''اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن'' بھی قائم کر دی۔ ۱۷/۱۸/اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنو میں نواب محسن الملک کی صدارت میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا جو بہت کامیاب رہا۔ اس جلسے میں پنجاب کی نمائندگی شیخ عبدالقادر، میر غلام بھیک نیرنگ اور مرزا اعجاز حسین نے کی۔ اینٹونی میکڈانل اس بات سے خاصا برہم تھا کہ پنجاب سے تین آدمی کیوں اس جلسے میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ ان کی نقل و حرکت کی خاصی نگرانی کی جا رہی تھی۔ اس عظیم الشان جلسے میں شیخ عبدالقادر نے خطاب میں فرمایا:

''اردو کا مسئلہ صرف صوبہ جات متحدہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ سارے ملک کے ان حصوں سے متعلق ہے جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہم ''مجروح اردو'' کی پکار سن کر آئے ہیں''۔[۱]

شیخ عبدالقادر اس ضمن میں فرماتے ہیں:

''جب لکھنو میں اردو پر ہندی کی یورش ہوئی تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ نواب محسن الملک کی صدارت میں اجلاس ہوئے۔

پنجاب سے میں، نیرنگ اور اعجاز بھی گئے۔ ہمارے جانے سے وہاں بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ سی آئی ڈی والے ان سے دریافت کریں کہ یہ تین پنجابی یوپی میں کیوں آئے؟ ہمارے والد صاحبان کے نام دریافت کیے گئے۔ حامد علی خاں صاحب سیکرٹری تھے۔ انہوں نے نہ بتایا۔ مجھے خیال آیا کہ کہہ دوں: ''وجہ یہ ہے کہ جو یوپی کی ''اردو مقتول'' ہوئی تو اس نے ''پنجاب کی اردو'' کو آواز دی، خبردار! ہم تو اپنی مصیبت کے علاج کے لیے آئے ہیں۔ مجھے ایک انگریزی Stanza یاد آیا۔ ہمارے مزار تو ذرا کم بولتے ہیں:

Remember me as you pass by,

As you are now once was I:

As I am now so you shall be,

So prepare yourself to follow me۔[۲]

نواب محسن الملک نے وہ دھواں دھار تقریر جو ریکارڈ کیے جانے کے قابل تھی اور کہا: ''اردو نہیں مرے گی، اگر مرے گی تو عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' کے مصداق اس کا جنازہ بھی دھوم سے نکلے گا''۔[۳]

شیخ عبدالقادر نے ایک دوسری جگہ یوں تحریر فرمایا ہے:

''آخر میں نواب صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر حکومت اردو کو مٹانے پر ہی تل گئی ہے تو بہت اچھا! ہم ''اردو کی لاش'' کو دریائے گومتی میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا:

چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے[۴]

''چونکہ نواب صاحب علی گڑھ کالج کے سیکرٹری تھے اور کالج کو (حکومت سے) گرانٹ ملتی تھی، فوراً نوٹس آیا کہ علی گڑھ کالج کی گرانٹ بند، گو حضور میکڈانل کو بہت تکلیف ہوئی لیکن وہ جملہ کام کر گیا، ہندی اردو یکجا کر دی گئی''۔[۵]

''اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن'' کے زیر اہتمام احتجاجی جلسہ ۱۷/۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو منعقد ہوا جس میں شیخ عبدالقادر نہ صرف شریک ہوئے بلکہ تقریر بھی کی۔ چنانچہ ''اردو ہندی تنازعہ'' کے سلسلے میں شیخ عبدالقادر اور نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین صاحب کے درمیان خط و کتابت ہوئی اور نواب محسن الملک کے استعفیٰ پر اظہار خیال ہوا۔ نواب وقارالملک نے شیخ صاحب موصوف کے نام جو مکاتیب تحریر فرمائے، ہمیں وہ تو دستیاب نہیں ہو سکے البتہ شیخ عبدالقادر کے دو مکاتیب ملے ہیں جو اس اہم اور تاریخی موضوع پر روشنی ڈالتے ہیں۔ شیخ صاحب نے شملہ سے ۹ ستمبر ۱۹۰۰ء کو نواب وقارالملک کے نام جو خط تحریر کیا اس میں لکھا:

جناب مخدومی و مکرمی نواب صاحب بہادر دام الطافکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! جو تفصیل نواب محسن الملک بہادر کے استعفیٰ کی وجوہات کی آپ نے تحریر فرمائیں، اس کا شکریہ۔ نواب صاحب بہادر کا اپنا خط بھی اس سے پہلے اس مضمون کا پہنچ چکا تھا مگر نواب محمد حیات خان صاحب نے پھر زور سے ان کو تاکید واپسی استعفیٰ کی لکھی ہے۔ انہوں نے آنریبل مسٹر رواز ممبر کونسل عالیہ سے اس باب میں مشورہ کیا تھا اور صاحب موصوف نے جواب میں کہا کہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے گورنمنٹ آف انڈیا سیکرٹری کالج کی جانب سے بدستور مطمئن ہے۔ اور شاید مسٹر اینٹونی ویسے ہی سیکرٹری صاحب اردو ڈیفنس کی وجہ سے ناراض ہوں مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ اس سبب سے کالج کو نقصان

پہنچائیں نیز یہ کہا کہ ان کی رائے میں نواب محسن الملک کی تقریر اور جو تجاویز اس میں پیش کی گئی ہیں، معقول معلوم ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں کی اطلاع نواب صاحب کو دے دی گئی ہے۔ اب یہ بھی قرار پایا ہے کہ آنریبل نواب محمد حیات خاں صاحب دو سوال اردو کے متعلق ۵/اکتوبر کی کونسل عالیہ میں کریں جن کا مضمون حسب ذیل ہو:

نمبر۱: کیا گورنمنٹ آف انڈیا کو اس اضطراب سے آگاہی ہے جو ممالک مغربی وشمالی کے مسلمانوں میں لوکل گورنمنٹ کے ریزولیوشن ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کے نفاذ سے پیدا ہو رہا ہے جس کے ذریعے سے ناگری کا رواج عدالتوں میں جائز کیا گیا ہے اور جس کی ترمیم میں عدالتی عہدوں کے لیے ہندی زبان کا جاننا لازمی ٹھہرایا گیا ہے؟

نمبر۲: کیا گورنمنٹ آف انڈیا، الفاظ ''عرضی واستغاثہ'' کی تشریح کی بابت ہائی کورٹ الہ آباد اور عدالت جوڈیشل کمشنر اودھ میں اختلاف ہوا ہے تاکہ اس تشریح سے ناگری حروف کے استعمال کی اجازت سے ایسے لوگوں تک کر دی جائے جو سوائے ناگری حروف کے اور کوئی حروف نہیں جانتے اور جو اپنی عرائض بلاواسطہ اصحاب قانون پیشہ کے اپنے ہاتھ سے پیش کریں''۔

میں جانتا ہوں یہ سوالات عین آپ کی منشا کے مطابق ہوں گے۔

رقعہ نواب محسن الملک بہادر واپس ارسال خدمت شریف ہے۔ از جانب آنریبل نواب صاحب سلام شوق!

آپ کی تقریر میں ترمیم کا مجھے کوئی منصب نہیں۔ آپ نہ صرف میرے بزرگ ہیں بلکہ ''قوم کے بزرگ ہیں'' وہ جتنا بھی اختصار ہوا ہے یوں ہوا ہے کہ ایک ہی مطالب کا کسی قدر اعادہ تھا اور وہ انگریزی میں شاید مستحسن نہ معلوم ہوتا۔

بندہ عبدالقادر ۶

شیخ عبدالقادر نے دوسرا مکتوب بھی شملہ ہی سے نواب وقار الملک کو ۱۳/ستمبر ۱۹۰۰ء کو تحریر کیا جس میں رقمطراز ہیں:

جناب مکرمی ومخدومی نواب صاحب بہادر

السلام علیکم! آپ کے دونوں عنایت نامے پیہم شرف صدور لائے تقریر آپ کی ''آبزرور'' میں چھپ گئی ہے۔ آخر کے حصہ میں میں نے کسی قدر اختصار کر لیا ہے، معاف فرمایئے۔ اگر آبزرور کی کاپیاں جس میں وہ تقریر درج ہے آپ کو نہیں ملیں تو عنقریب مل جائیں گی۔

میں نے نواب محمد حیات خاں صاحب کو آپ کے دونوں خطوط کے پیغام دے دیے تھے۔ وہ جواب میں سلام شوق عرض کرتے ہیں اور یاد آوری کے ممنون ہیں مگر آپ نے جو ٹرسٹیان پنجاب میں کسی کے سیکرٹری ہونے کی نسبت تحریر فرمایا ہے اگر نواب صاحب محسن الملک استعفیٰ پر مصر رہیں تو اس کی توقع نہیں ہو سکتی۔ نواب محمد حیات خان صاحب اپنے کاروبار میں اس قدر منہمک ہیں کہ ان کا چھٹکارا مشکل ہے۔ آپ کو معلوم ہے پنجاب کونسل کے ممبر ہیں۔ راولپنڈی میں آنریری ڈسٹرکٹ جج وڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں دو تین ضلعوں میں زمینداری کرتے ہیں اور کئی جھگڑے ہیں جو وہ اپنے ذمے لیے ہوئے ہیں وہ جب تک ان سب کو خیر باد نہ کہہ دیں علی گڑھ نہیں آ سکتے اور اس قدر ایثار اس زمانے میں کس سے ہو سکتا ہے۔

خان بہادر برکت علی خان صاحب کی نسبت آپ خود تحریر فرماتے ہیں کہ وہ بہت بوڑھے ہیں۔

نواب محمد حیات خاں صاحب نے نواب محسن الملک بہادر کے استعفیٰ کا ذکر آنریبل مسٹر رواز سے جو گورنمنٹ انڈیا کے

ہوم سیکرٹری ہیں، کیا ہے۔ انہوں نے نہایت افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ ہم ہرگز سر اینٹونی میکڈانل سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ ریزولیوشن کی مخالفت کی ناراضگی کا کالج پر کچھ اثر ہونے دیں اور کم از کم گورنمنٹ آف انڈیا کو نواب محسن الملک سے کوئی ناراضگی نہیں۔ انہیں اپنے کام پر بدستور رہنا چاہیے۔ اس لیے نواب محسن الملک صاحب کو یہاں سے زور کا خط استعفیٰ واپس لینے کے لیے لکھا گیا ہے۔ زیادہ نیاز

بندہ عبدالقادر ۷

## حواشی

۱ مجلہ فاران اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور ۱۹۸۴ء، ص ۵۲ تا ۵۴

۲ مقالات عبدالقادر مرتبہ محمد حنیف شاہد، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۸۳

۳ حصول پاکستان مرتبہ احمد سعید، لاہور: ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۸۳ء، ص ۵۸ تا ۵۹

۴ حوالہ مذکور

۵ مقالات عبدالقادر مرتبہ محمد حنیف شاہد، ص ۸۲ تا ۸۳

۶ قلمی مکتوب شیخ عبدالقادر محررہ ۹ ستمبر ۱۹۰۰ء بنام نواب محسن الملک بہادر جو شیخ منظور قادر خلف الرشید شیخ عبدالقادر نے راقم کو عنایت فرمایا۔
نواب مولوی مشتاق حسین وقار الملک (۱۸۳۹ء تا ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء) سرسید احمد خاں کے نورتنوں میں سے تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے سیکرٹری اور علی گڑھ کالج کے سیکرٹری۔ آپ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے بعض جگہ تحریر ہے کہ آپ ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ سرسید احمد خان اور نواب محسن الملک کے بعد مسلمانوں کی قیادت جس بزرگ ہستی کے ہاتھوں میں آئی قوم انہیں وقار الملک کے نام سے یاد کرتی ہے۔
نواب وقار الملک کو سرسید احمد خاں کے ساتھ سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں ان کو سوسائٹی کا ''رفیق'' مقرر کیا گیا اور ایک انگریزی کتاب ''انقلاب فرانس اور نپولین'' کا اردو ترجمہ کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔
نواب محسن الملک کی وفات کے بعد نواب وقار الملک کو تین سال کے لیے کالج کا آنریری سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس موقع پر قائم مقام سیکرٹری نواب مزمل اللہ خان نے فرمایا: ''نواب محسن الملک کی وفات حسرت آیات کے وقت سے ہندوستان کے تمام مسلمان نہایت آرزومندانہ دلی جوش سے یہ صدا بلند کر رہے تھے کہ نواب وقار الملک مدرسۃ العلوم کے سیکرٹری مقرر کیے جائیں''۔ سر میاں محمد شفیع نے نواب صاحب کی تقرری بحیثیت آنریری سیکرٹری کا خیر مقدم کرتے ہوئے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ کراچی میں ایک قرارداد ان الفاظ میں پیش کی: ''اس کانفرنس کی رائے میں نواب وقار الملک سے بہتر کوئی شخص نواب محسن الملک کی جانشینی کے لیے نہیں مل سکتا''۔

نواب وقار الملک نے اردو ہندی تنازعہ، پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے قیام، شملہ وفد و آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام، جداگانہ انتخاب، اٹلی کے طرابلس پر حملے اور حادثہ مچھلی بازار کانپور کے سلسلے میں جو شاندار اور تاریخ ساز خدمات انجام دیں انہیں مستقبل کا تاریخ نویس نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

نواب وقار الملک نے ۲۸ جنوری ۱۹۱۷ء کو امروہہ میں انتقال فرمایا۔ ان کی وفات پر مولانا محمد علی جوہر نے فرمایا: ''ہندوستان اپنے فرزند بزرگ اور ہم اپنے باپ سے محروم ہو گئے''۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے حصول پاکستان مرتبہ احمد سعید صفحات ۲۸۴ تا ۲۹۰ اور ''ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان'' مولفہ ایس ایم اکرام، صفحات ۹۸ تا ۱۱۰

۷ قلمی مکتوب شیخ عبدالقادر بنام نواب وقار الملک بہادر محررہ ۱۳ ستمبر ۱۹۰۰ء جو شیخ منظور قادر خلف الرشید شیخ عبدالقادر نے راقم کو مرحمت فرمایا۔

# یادوں کے دیئے

ڈاکٹر انور سدید

محمد حمزہ فاروقی اردو ادب کے ایک سنجیدہ قاری ہیں، وہ جس کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں اس کے مطالب و معانی اپنے دل میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مطالعے کو مزید منور کرنے کے لیے اپنے موضوع کے گرد و پیش کی کتاب کو بھی تلاش کر کے پڑھتے اور اپنے ذاتی نتائج اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مطالعہ تفریحی نہیں بلکہ اس مثبت مقصد کا آئینہ دار ہے کہ انہوں نے اپنے مطالعے کی اساس پر متعدد ایسی کتابیں تالیف کی ہیں جن میں ان کی تلاش و جستجو کا عمل نمایاں نظر آتا ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے شوق مطالعہ نے اب تخلیق ادب کا درجہ اختیار کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں بیرونی دنیا کے چند بے حد اہم سفر کیے لیکن سفر کے تاثرات پر مبنی سفر نامہ نہیں لکھا حالاں کہ مولانا شبلی نعمانی سفر نامہ ''بلاد روم و مصر و شام'' لکھ کر سفر نامہ نگاری کی ایک روشن روایت قائم کر گئے تھے جسے بعد میں متعدد نامور ادیبوں نے پروان چڑھایا۔

محمد حمزہ فاروقی نے علامہ اقبال کے حالات، حیات اور ان کے اسفار کے حالات پڑھے تو ایک نادر کتاب ''سفر نامہ اقبال'' ۱۹۷۳ء میں شائع کی جو متعدد اضافوں کے بعد ۱۹۸۹ء میں دوسری بار اور ۱۹۹۸ء میں تیسری بار شائع ہوئی۔ قیاس غالب یہ ہے کہ اقبال کا سفر نامہ تالیف کرنے سے خود ان کے دل میں بھی بیرونی دنیا کو ایک سیاح کی نظر سے دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اب ان کا پاؤں ہر وقت گردش میں رہتا ہے اور ان کے تین سفر نامے ''زمان و مکان اور بھی ہیں'' (۱۹۷۸)۔ ''آج بھی اس دیس میں'' (۱۹۸۲) اور سفر آشوب (۱۹۸۷) منظر عام پر آ چکے ہیں جنہیں سفر نامہ نگاری کی تاریخ میں بلند مقام حاصل ہے۔

میرے دوست ضیاء اللہ کھوکھر جب گوجرانوالہ میں اپنے والد گرامی کے نام پر قائم لائبریری میں موجود سفر ناموں کی فہرست ''نوادرات'' کے نام سے شائع کر رہے تھے تو وہ ان تین سفر ناموں کی بہت تعریف کرتے تھے۔ کہنے لگے ''میں نے اپنی فہرست میں نام لکھنے کے لیے'' سفر نامہ ''زمان و مکاں اور بھی ہیں'' کھولا تو اسے پڑھتا چلا گیا اور اسے ختم کر کے میں نے باقی دو سفر نامے بھی پڑھے اور حیرت زدہ ہوا کہ جو معلومات اور تاثرات حمزہ فاروقی صاحب نے ان ممالک کے بارے میں پیش کیے تھے وہ معلومات انہیں ممالک کے مقبول عام سفر ناموں سے دستیاب نہیں تھیں۔ ضیاء اللہ کھوکھر کی یہ بات شبیر احمد میواتی بھی سن رہے تھے، رخصت ہونے لگے تو یہ سفر نامے عاریتاً ساتھ لے آئے کہ وہ اپنے سابقہ مطالعے کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ ان کی تلاش و جستجو کے چند قیمتی ثمرات ''حیات اقبال کے چند مخفی گوشے'' (۱۹۸۸)۔ اقبال کا سیاسی سفر (۱۹۹۲ء)۔ مولانا عبدالمجید کے ''افکار و حوادث'' کی چار جلدیں اور ''غلام عباس کے نام لکھے ہوئے مختلف ادیبوں کے خطوط'' ہیں جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئے۔

یہاں اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ زندگی کے عمل اور سفر کے دوران محمد حمزہ فاروقی شخصیات کا مطالعہ اپنے باطن کی آنکھ سے کرتے رہتے ہیں، میرے محترم دوست مشفق خواجہ کو (جو اب اس دنیا سے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو رخصت ہو گئے) محمد حمزہ

فاروقی کے ان شخصی مطالعات کا علم تھا، چنانچہ انہوں نے ان سے مولانا غلام رسول مہر کا خاکہ لکھوایا اور ۱۹۸۳ء میں اپنے جلیل القدر رسالہ ''تخلیقی ادب'' میں شائع کیا۔ ان کا ایک اور اہم خاکہ یوسف سلیم چشتی پر ہے اسے بھی مشفق خواجہ صاحب نے ۱۹۸۹ء میں رسالہ ''غالب'' میں شائع کیا اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوا تو ایک درجن سے زائد خاکے لکھے جا چکے تھے۔ میرے سامنے ان تمام خاکوں کا مجموعہ (جنہیں شاید بر بنائے انکسار محمد حمزہ فاروقی نے ''مضامین کا مجموعہ'' قرار دیا ہے) جو ''یادوں کے دیئے'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، رکھا ہے۔ یہ کتاب رسالہ ''مخزن'' کو تبصرے کے لیے بھیجی گئی تھی، میں ''مخزن'' کے مدیر ڈاکٹر وحید قریشی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی تبصرہ نگاری کا فرض مجھے سونپا اور اس طرح ایک اچھی کتاب کے مطالعے کا شرف عطا کیا بلکہ ان متعدد نامور اصحاب سے ملاقات غائبانہ کا موقعہ بھی عطا کیا کہ جو اب اپنا رخت حیات سمیٹ کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

ان اصحاب سے محمد حمزہ فاروقی نے زندگی کے مختلف ادوار میں نہ صرف ملاقاتیں کیں اور ادب و تکلف کی حد بندیوں کو قائم رکھا بلکہ ان سے مستفید بھی ہوتے رہے۔ محمد حمزہ فاروقی نے لکھا ہے:

''اب ان سے عالم فانی میں ملنے کا امکان نہیں۔ ان حضرات کا تعلق مقتدر طبقے سے نہیں تھا، لیکن وہ اپنے رفقاء کے دلوں پر راج کرتے تھے۔ ان کے پاس دولت کے انبار نہ تھے لیکن وہ علم، کردار اور اخلاق عالیہ کے ''سرمایہ دار'' تھے۔ انہوں نے معاشرے سے کچھ چھینا نہ تھا بلکہ اپنے علم اور کردار سے اسے سنوارا تھا۔ ان افراد کے رخصت ہونے سے بستی اور معاشرے کی تہی دامنی کا احساس ابھرتا ہے''۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں معاشرے کو اپنے علم اور کردار سے سنوارنے والے ان چند اصحاب کے نام گنوا دوں جن کی روشن یادیں محمد حمزہ فاروقی کا سرمایہ ہیں۔ اب یہ یادیں ان کی لوحِ دماغ سے پرواز کر کے ''یادوں کے دیئے'' بن گئی ہیں اور اس کتاب میں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ یہ تیرہ نام حسب ذیل ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی | ۲۔ مولانا غلام رسول مہر | ۳۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری |
| ۴۔ ڈاکٹر امیر حسین صدیقی | ۵۔ مولانا سید ابن حسن جارچوی | ۶۔ ڈاکٹر ریاض الحسن |
| ۷۔ بشیر احمد ڈار | ۸۔ عاشق حسین بٹالوی | ۹۔ ظفر حسن ایبک |
| ۱۰۔ سعید شامل | ۱۱۔ شاہ حسن عطا | ۱۲۔ پروفیسر مرزا محمد منور اور |

۱۳۔ سید معین الدین شاہ

یہ سب اصحاب اپنے علم و کردار کے انفرادی گوشے رکھتے تھے، ہر گوشہ موضوعی اور معروضی لحاظ سے اہمیت رکھتا تھا اور اس میں اتنی مقناطیسی کشش تھی کہ ملنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا۔ مثلاً یوسف سلیم چشتی کی اقبال شناسی اور ان کی شرح نویسی ان کے بنیادی تشخص کا مستقل وسیلہ تھی، محمد حمزہ فاروقی کے نزدیک چشتی صاحب کا علم و فضل دریا کی موج کی مانند تھا جسے ''کشتی کسی کی پار لگے یا درمیاں رہے'' سے واسطہ نہیں تھا۔ اس خاکے کی یادیں چشتی صاحب کے دریائے طغیان آسا کی موجوں کا نظارہ پیش کرتی ہیں اور محمد حمزہ فاروقی ان کے تذکرے سے اپنے ممدوح کی فطرت نگاری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک مجلس میں انہوں نے مولانا یوسف سلیم چشتی سے کہا:

''اقبال کی تصنیف Reconstruction of Religioun thought in Islam کو سمجھنا بہت دشوار ہے''۔

مولانا نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور فرمایا ''اگر عباسیوں کے عہد میں یہ کتاب شائع ہوتی تو اسلامی دنیا میں فکری انقلاب برپا کر دیتی، لیکن برصغیر کے مسلمانوں نے اسے بہت کم پڑھا اور استفادہ کیا۔ مجھے موقع نہیں ملا ورنہ میں اس کی شرح

بھی کر ڈالتا''۔

مولانا اقبال کی تصانیف میں جاوید نامہ، زبور عجم اور بال جبریل کے بہت مداح تھے۔ ''مسجد قرطبہ'' کو آپ اقبال کا لافانی شاہکار قرار دیتے تھے''۔ (یادوں کے دیئے''۔ از محمد حمزہ فاروقی۔ص ۱۷۔ دانیال، کراچی، ۲۰۰۱)

یوسف سلیم چشتی غصے کی ''جھونجھ'' میں کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ محمد حمزہ فاروقی نے ایک واقعہ لکھا ہے:

''ایک محفل میں مولانا تحریک آزادی کے اکابر کی نالائقی پر ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ذکر اقبال کا آیا تو غصے کی جھونجھ میں اقبال بھی چند کلمات سخت کے مستحق ٹھہرے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا اقبال کو تو بخش دیجئے، وہ تو آپ کا ذریعہ معاش ہے''۔ غصے کے یہ بادل بن برسے ٹلنے والے نہ تھے..... (حوالہ ایضاً، ص ۱۵)

یہ واقعہ یوسف سلیم چشتی کی شدت پسندی کا مظہر ہے جس کا ایک اور نقش حسب ذیل ہے:

''آپ..... انجمن ترقی پسند مصنفین کے سخت مخالف تھے، آپ کے نزدیک اس ادارے سے وابستہ شعرا اور ادیب غیروں کے نقیب، شرفا کے رقیب اور ففتھ کالمسٹ تھے۔ ان کے جلسے جو ہر سال ہوتے تھے، درحقیقت موقع پرستوں کے لیے دعوت عام اور بدنامی عوام کا دربار تھے''۔

محمد حمزہ فاروقی نے اس شدت پسندی کو چشتی صاحب کی ذاتی محرومیوں اور ناکامیوں کا نتیجہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ ''انہیں اس امر کا احساس تھا کہ معاشرے نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کی خاطر خواہ قدر نہ کی۔ حمزہ فاروقی کا درج ذیل تجزیہ مبنی برحقیقت ہے:

''ملک میں جو استحصالی اور غیر انسانی نظام رائج تھا، اس میں حقیقی اہل علم کے پنپنے یا ان کی قدردانی کی روایت باقی نہ رہی تھی، مقبولیت کے سکے معاشرے میں رائج تھے مثلاً مکر و فریب، خوشامد اور بے اصولی وغیرہ''۔

اور اپنی رائے دی کہ ''ان سے مولانا (چشتی) کا دامن ہمیشہ خالی رہا۔ ساری عمر آپ اکل حلال اور صدق مقال پر عامل رہے''۔

میں ذاتی طور پر اخباری اور اشتہاری شہرت کی چاندنی میں پون صدی سے بھی زیادہ عمر گزارنے اور رسائل و اخبارات میں تحسین آمیز اور اسمائے تفضیل سے مرصع مضامین چھپوانے والوں کو شدید مایوسی کا شکار اور اپنی زندگی میں ہی نظر انداز کر دیئے جانے کے احساس سے دوچار دیکھتا ہوں تو پروفیسر یوسف سلیم چشتی اردو ادب کے فتح مند ادیب نظر آتے ہیں جن کی اقبال شناسی کا زاویہ بیسویں صدی کو عبور کر کے اب اکیسویں صدی میں اپنی قبولیت کا سفر طے کر رہا ہے۔ محمد حمزہ فاروقی نے دنیاداری سے بے نیاز علمی رجحان رکھنے والے اس ادیب کے ''دل بیدار'' کا تذکرہ شاہ حسن عطا مرحوم کے حوالے سے یوں کیا ہے:

''مولانا اپنی ایک عقیدت مند خاتون کو جو ان سے عمر میں بہت چھوٹی تھیں، خط لکھا کرتے تھے، ان میں تصوف اور فلسفہ کے نکات دل کش ادبی پیرائے میں بیان کیے جاتے اور ممدوحہ میں حوروں کی صفات تلاش کی جاتیں۔ شاہ (حسن عطا) صاحب کا کہنا تھا کہ اگر یہ خطوط منظر عام پر آ جاتے تو رنگینی بیان اور دلآویزی کے اعتبار سے ''خطوط شبلی بنام عطیہ فیضی'' کی مانند ادبی دنیا میں نقش دوام چھوڑ جاتے۔ خط کے آخر میں مولانا (چشتی) اپنا نام اس طرح لکھتے:

''مجموعہ عیوب زشتی۔ یوسف سلیم چشتی''۔ (حوالہ ایضاً، ص ۱۳)

معاف کیجئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے کرداری تذکرے میں طوالت در آئی، میرا خیال ہے کہ میں نے اختصار سے کام

لیا ہے۔ چشتی صاحب کا تذکرہ اتنا لذیذ ہے کہ پورا مضمون اقتباس ہونا چاہیے تھا، اس میں خوبی محمد حمزہ فاروقی کی بھی ہے کہ انہوں نے اپنی یادوں کی بازیافت سے ہر خاکے کو معلوماتی اور واقعاتی ہی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے لذیذ تر بنانے کی کاوش بھی کی ہے اور ایک لحاظ سے خاکہ نویسی کے وسیلے سے تاریخ نگاری کا فریضہ ادا کیا ہے اور ہر واقعے کو اپنی بیانیہ شہادت فراہم کر دی ہے جو معکوس انداز میں بہجت کی افزائش بھی کرتی ہے۔ مولانا سید ابن الحسن جارچوی کے خاکے میں ایک لطافت انگیز واقعہ یوں درج ہے:۔

''کنونشن مسلم لیگ نے کراچی میں بہت دھوم دھام سے فیلڈ مارشل ایوب خاں کی صدارت میں جلسہ منعقد کیا۔ کراچی کے میئر حبیب اللہ پراچہ تھے، جنہوں نے سرکاری توفیق ارزانی سے جلسے کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ مقررین میں مولانا جارچوی بھی تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ ''ایک راجہ کی لیگ ہے اور دوسری خواجہ کی لیگ۔ عوام پریشان ہیں کہ کدھر جائیں''۔ اگلے روز مولانا (جارچوی) کا یہ جملہ زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ پراچہ صاحب نے جلسے کے بعد مولانا سے کہا کہ ''آپ نے تو غضب کر دیا۔ اگر ایوب خان ناراض ہو کر ہم دونوں کو قید کر دیتا تو کیا ہوتا''۔ مولانا (جارچوی) نے جواب دیا: ''کچھ بھی فرق نہ پڑتا۔ میرا گھر تو ویسے بھی جیل کی مانند ہے۔ آپ کے طفیل مجھے بھی قید خانہ میں اعلیٰ درجہ مل جاتا۔ پھر ہم دونوں اکٹھے ہی قید سے لطف اندوز ہوتے''۔

مہاتما گاندھی کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ''وہ بے حد چالاک اور ذہین سیاست دان تھے''۔ (حوالہ ایضاً، ص ۱۰۸)

بقول محمد حمزہ فاروقی ''اتاترک کے بارے میں سعید شامل کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہ تھی لیکن آپ چند خامیوں کے باوجود بے حد ذہین و فطین اور جنگ آزادی کے لیے ناگزیر قرار دیتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ:

''اتاترک کا قد متوسط، آنکھیں نیلی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اور چہرے سے عزم کی پختگی اور سختی ظاہر ہوتی تھی۔ کثرت شراب نوشی کی بنا پر آخر عمر میں ان کا جگر خراب ہو گیا تھا۔ عورتوں کے شائق تھے اور خاندانی زندگی کے بکھیڑوں سے آزاد رہنا چاہتے تھے۔ لطیفہ خانم سے ان کی ناچاقی اور طلاق کا سبب یہ تھا کہ وہ کسی قسم کی پابندی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اتاترک کا طرز حکومت آمرانہ تھا لیکن یہ انداز ترکی کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بے حد ضروری تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کو یا تو رام کرنے کی کوشش کرتے یا پھر راستے سے ہٹا دیتے''۔ اس ضمن میں سعید شامل نے حسن رؤف پر قاتلانہ حملے کی مثال دی جس میں رؤف بے کے دھوکے میں عبدالرحمٰن پشاوری۔۔ حملہ آور کی گولیوں کا نشانہ بن گئے''۔ (ص ۱۱۰۔ حوالہ ایضاً)

خاکہ نگاری کے لیے شخصیات کا انتخاب محمد حمزہ فاروقی کا اپنا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک شخصیت اور ان کے کارناموں کا تاثر خاکہ نگار کے ذاتی مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو، اچھا خاکہ تخلیق نہیں ہو سکتا۔ ان شخصیات کو محمد حمزہ فاروقی نے اپنے دل کے آئینے سے دیکھا تو ان کی مثبت اقدار منعکس ہوتی چلی گئیں۔ خاکوں کی ترتیب کے دوران انہیں گزرے ہوئے دور اور مٹتی ہوئی اقدار کے زیاں کا احساس بھی تھا۔ حالات کی موجودہ رفتار میں انہیں اخلاقی بہتری کے آثار نظر نہیں آتے۔ لیکن ان کا رویہ رجائیت آمیز ہے۔ ان کی یادوں کے دیئے اس رجائیت ہی کے نقوش تاباں ہیں اور ان کا حسن اسلوب مطالعے کو لطافت بار کرتا چلا جاتا ہے۔

''یادوں کے دیئے'' (خاکوں کا مجموعہ) ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ قیمت ۱۶۰ روپے۔ سفید کاغذ پر اعلیٰ درجے کی کمپیوٹر کتابت۔ مضبوط جلد پر خوبصورت سرورق۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ دانیال۔ وکٹوریہ چیمبرز (۲) عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

# نفائس ادب

ریاض احمد

مولانا حامد علی خاں۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔ اس علمی، ادبی اور صحافتی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جس نے اس برصغیر میں ایک مدت تک وہ شمعیں روشن رکھیں کہ جن کے اجالے سے ان گنت دماغوں نے روشنی حاصل کی۔ اور ایک خاص بات اس خانوادے کے متعلق یہ بھی ہے کہ اس کا ہر فرد اپنی جگہ فرد وحید تھا۔ ان کے ہاں جلال و جمال کا حیرت انگیز امتزاج پایا جاتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کا جلال ان کی دینی اور ملی حمیت میں ایک متین انداز میں ظاہر ہوا تو اس کا ہنگامہ خیز اظہار ان کے ولولہ آزادی اور دبنگ صحافت میں۔ تقریر و تحریر (نظم ہو یا نثر) میں وہ شعلہ نوا تھا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کا جمالی رنگ طبیعت بھی ان کی علمی فتوحات اور خصوصاً فن شعر میں نکتہ عروج پر تھا۔ ان کی نعت میں جو گداز پایا جاتا ہے وہ یوں کہیے نصیبوں کی بات تھی۔ کامل الفن تھے کہ ایک زمین میں دو شعر کہہ گئے اور کوئی اس زمین میں تیسرے شعر کا اضافہ نہ کر سکا۔

مولانا حامد علی خاں اور پروفیسر حمید احمد کے جلال کا مظہر ان کی اصول پسندی تھی۔ علم و ادب میں ان کی جمالی شان نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ایک بلند ادبی معیار میں کچھ کچھ جلال کا پرتو بھی ہے۔

مولانا حامد علی خاں نے اپنے خاندان میں سب سے طویل عمر پائی اور آخر دم تک ان کی ادبی اور علمی سرگرمیوں میں تعطل کا کوئی لمحہ نہیں آیا۔ نفائس ادب ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جسے ان کے فرزند زاہد علی خاں نے پروفیسر جعفر بلوچ کی معاونت سے مرتب کیا ہے۔ اس سے پہلے زاہد علی خاں مولانا کے نام موصول ہونے والے خطوط کا ایک نادر مجموعہ شائع کر چکے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں کی ایک مشترکہ صفت یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہم عصر ادبی سرگرمیوں کو ایک مستند شہادت میسر آتی ہے۔ کئی نام اور کئی تصنیفات جو زمانے کی قدر ناشناسی کی وجہ سے تقریباً فراموش ہوتی جا رہی تھیں، ان کے ذریعے نئی نسل گویا ان سے از سر نو متعارف ہونے کی سعادت حاصل کرتی ہے۔ ہمیں زاہد علی خاں کا بالخصوص شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے ان نوادرات کی خاندانی ورثہ کے طور پر حفاظت کی بلکہ ان کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ اس صفت میں ان کا کوئی مثیل ہو سکتا ہے تو وہ کرنل زریں بخت مفتی ہیں۔ جنہوں نے ایک قلیل مدت میں اپنے والد مرحوم رحمان مذنب کی جملہ تصنیفات کو شائع کرنے کا کمال تندہی سے انتظام کیا ہے۔

پیش نظر مجموعے میں مولانا کے مضامین کو مختلف جرائد سے حاصل کر کے کتابی شکل میں مدون کرنے میں پروفیسر جعفر بلوچ کی ہنرمندی کی داد نہ دینا ایک طرح کی ادبی اور علمی کم ظرفی ہوگی جو مضامین کی ترتیب و تدوین میں اپنے تجربے، ادبی سوجھ بوجھ اور جانت کو ایک قابل ستائش سطح پر بروئے کار لائے ہیں۔ یہ مجموعہ دراصل ایک رنگا رنگ مرقع ہے۔ اس کا اندازہ اس کے مختلف ابواب کے لیے مولفین کے قائم کردہ عنوانات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ یہ عنوانات اس وجہ سے بھی اہم ہیں کہ ان سے مضامین کی نوعیت کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی مطالعہ یا حوالے کے لیے مطلوبہ مضمون کی تلاش کی زحمت سے قاری بچ جاتا ہے۔

تاہم اپنی کور ذوقی یا عجلت پسندی کے باعث ابتدا میں مجھے ایک عجیب واردات سے دوچار ہونا پڑا۔ غالب کے حوالے

سے مولانا کا جو تصور ذہن میں محفوظ تھا۔ اس کے زیر اثر میں نے سب سے پہلے غالب اور ان کی فارسی شاعری والا مضمون پڑھا تو میں کچھ بدمزہ ہوا۔ ایک وجہ اس کی یہ تھی کہ ابھی ابھی غالب پر پروفیسر حمید احمد خاں کے مضامین کے دوبارہ مطالعے سے فارغ ہوا تھا۔ اس حوالے سے اور خود مصنف مرحوم کی علمی وجاہت کا جو تصور ذہن میں تھا اس کے باعث ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ یہ مضمون بھی لازماً ادق مطالب پر مشتمل ہوگا، لیکن یہاں تو بات بہت سیدھے سادے انداز میں کی گئی تھی۔ کچھ دوسرے مضامین کو پڑھنے کے بعد جب دوبارہ اس مضمون کو پڑھا تو اس نے اپنی معنویت کو مجھ پر منکشف کیا کہ غالب کے خاندان ''ایبک'' کی لغوی تحقیق میں غلط فہمی کے ازالے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کے مختلف مراحل ان کی فارسی دانی اور فارسی شاعری میں کمال کا ایک بھرپور جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ جو پہلی دفعہ میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ میرا حال ان سخن فہم کشمیری امراء کا سا تھا جو ''افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را'' پر دوسرا مصرع لگانے میں سرگرداں تھے کہ اتنے میں کشمیر کا مجذوب شاعر گلی سے گزرتے ہوئے نظر آیا۔ وہ کسی حیلے اسے مجلس میں لے آئے اور جب مصرع کی فرمائش کی تو وہ بھنا کر یہ کہتا ہوا مجلس سے اٹھ گیا: ''در مجلس خود راہ مدہ ہیچو منے را'' امرا اپنی جگہ متاسف تھے کہ مجذوب ہاتھ سے نکل گیا کہ اچانک ایک صاحب بول اٹھے: ''صاحبو مجذوب تو مطلوبہ مصرع کہہ گیا ہے'' اور پھر شعر دہرایا۔ تو سب حاضرین مجلس سر دھنتے رہ گئے۔ غالب والا مضمون بھی کچھ اسی نوعیت کا حامل تھا۔ غالب کی انگریزی و فارسی میں اس کا خصوصی مقام وغیرہ سب کی توجیحات موجود تھیں اب میں سمجھا کہ غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی جو مدح کی تھی تو اس سے بھی مقصود اپنے شاعرانہ مقام کا احساس دلانا تھا اور یہ تقاضا کہ ان کے ساتھ ان کے مقام و مرتبے کے مطابق سلوک جائے۔ جس کی مشرقی معاشرے میں روایت ان کے پیش نظر تھی کہ بقول حالی وہ 'رشک عرفی وفخر طالب تھے' یہ بھی اپنی ذات پر اعتماد کا ایک اظہار تھا جس کو غالب نے اپنی حسن مزاح کے امتزاج سے اس طرح بدل لیا تھا کہ اپنے آپ پر اور اپنے مصائب پر بھی ہنسنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

مولانا حامد علی خاں کو اپنے تمام تر علم و فضل کے ساتھ ساتھ یہ ملکہ بھی حاصل ہوا تھا کہ وہ تنقید و تبصرے میں ایک ایسا انداز اختیار کر سکے جس کو شعر میں سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔ اس اسلوب کے لیے فراق گورکھپوری نے ہندی ترکیب بدن چورا اختراع کی تھی انگریزی کا سہارا لیں تو اسے Unpretentious کہیں گے۔ ساتھ ہی یہ شاید اس تربیت کا بھی اثر تھا جس کا ذکر مولانا نے میاں بشیر احمد مرحوم کے حوالے سے کیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے سامنے منصور احمد نے کسی لفظ کو غلط کہا تو میاں صاحب نے ان کی بات دہراتے ہوئے کہا ''کہ اچھا تو یہ صحیح نہیں ہے''۔ اسی رکھ رکھاؤ کا اہتمام ان سب مضامین میں نظر آتا ہے۔ جہاں اختلاف کا موقع آتا ہے وہاں انہوں نے گریز سے کام نہیں لیا کہ یہ علمی بددیانتی ہوتی۔ اقبال کے ہاں بیدل کے معاملے میں تضاد بیانی پر انہوں نے گرفت کی ہے۔ منشی نبی بخش کے ایک شعر کے متعلق غالب کی بیجا تحسین کو وہ قبول نہیں کرتے۔ غالب کے ایک شعر کی تشریح میں شارح سے اختلاف کرتے ہیں اور باتوں ہی باتوں میں مشرقی روایت میں عشق کے لفظ کے صحیح استعمال کرتے ہوئے سند میں میر کا حوالہ ہی نہیں دیتے بلکہ پنجابی محاورے سے بھی سند لاتے ہیں۔ اس موقعہ پر ایک نہایت بے تکلف انداز میں غالب کے کتنے ہی غلط طور پر رائج شعروں کی تصحیح بھی کر گئے ہیں۔ سید علی عباس جلال پوری کے ہاں اقبال کے ایک شعر کی غلط تعبیر سے تعرض کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر پنڈت کشن پرشاد کول کی پنجاب دشمنی پر کھل کر بات کرتے ہیں۔ مراۃ الشعرا میں انہیں شعرا کی درجہ بندی سے اختلاف ہے، لیکن کہیں بھی ان کے لہجے میں تلخی نہیں آتی طعن، تشنیع تو بہت دور کی بات ہے ان کے ہاں صرف دلیل محکم ہی کفایت کرتی ہے۔

قدیم اور جدید اردو ادب پر ان کی نظر بہت وسیع بھی تھی اور اتنی ہی وقیع بھی۔ میر حسن کی مثنوی پر ان کا تبصرہ پڑھ کر مجھے ذاتی طور پر حیرت ہوئی کہ مثنوی سے جو حوالے انہوں نے پیش کیے ہیں اردو ادب کے اساتذہ اعلیٰ درجوں میں اپنے لیکچروں میں تقریباً انہیں حوالوں سے استشہاد کرتے ہیں۔ اسی طرح مصور غم پر ان کا مضمون بصیرت افروز ہے۔

کتاب کے پہلے دو مضامین یعنی ''غزل کے پچاس شعر'' اور ''ادب میں روایت'' گزشتہ صدی کے اوائل میں جو تبدیلیاں ادبی روایت میں نمو پذیر ہوئیں، گویا ان کا آئینہ ہیں۔

ان مضامین کو ہم عصر ادبی سرگرمیوں کا عینی شاہد کہنے سے مراد یہ بھی ہے کہ بعض اہم ادبی شخصیات اور ان کی دین Contribution کو نہ صرف ذہنوں سے یکسر مٹ جانے سے بچا لیا گیا ہے بلکہ ان کی صحیح اندازہ دانی بھی نئی پود کے لیے مشعل راہ ہے۔ مثلاً میاں عبدالعزیز فلک پیما کہ ایک زمانے میں ان کے منفرد اسلوب کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اسی طرح حکیم آزاد انصاری کو تو گویا انہوں نے پہلی دفعہ نئی پود سے متعارف کرایا ہے۔ ان کی شاعری کا بھرپور انتخاب شامل مضمون کر کے ان کے اس ہاں اس اہتمام کا بالخصوص ذکر کیا ہے کہ وہ تعقید کو قطعاً روا نہیں رکھتے تھے۔ میاں بشیر احمد کی معروف شخصیت کو ادب اور سیاست میں ایک خاص مقام کی وجہ سے بھلایا نہیں جا سکتا، لیکن ان کی شاعری کا بھرپور اور جچا تلا تعارف صرف مولانا کے حصے میں آیا ہے۔ بالعموم ان کی ایک نظم مشہور ہے ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' اس نظم میں بندش کی چستی، الفاظ کی دروبست اور مخصوص آہنگ ان کے قادر الکلام شاعر ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ لیکن ان کی بقیہ شاعری سے بالعموم صرف نظر ہی روا رکھا گیا ہے۔ اس کی تلافی مولانا کے مضمون سے ہو گئی ہے۔ انہوں نے گویا پوری ادبی برادری کا اس مضمون کے ذریعے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ میاں صاحب کے ذاتی حالات کے ذیل میں اصغر بشیر کی بے وقت موت سے یاد آیا کہ ان کی وفات کے موقع پر ان کی دو آزاد نظمیں بھی شائع ہوئی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی خاندانی میراث کو آگے بڑھانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ تین بہن بھائی تھے جن کے لیے مرحوم نے The Trio کی ترکیب وضع کی تھی ان کی ایک نظم تھوڑی تھوڑی یاد رہ گئی ہے۔ آپ بھی سن لیجیے:

کس قدر غمناک ہے
میرے لیے تیرا آنا اے بہار
اس جان شیریں کے بغیر
اس روح تسکین کے بغیر
جب دل تمنائیں کرے
ان سے ملنے کے لیے

قسمت پلٹنے کے لیے
وہ مگر بیسود کر دیں سب تمنائیں مری
روند دیں نفرت سے سب گلپوش دنیائیں مری
پھر اگر سونے کے چھینٹوں میں بھی تو آئے تو کیا
آسماں سے تو اگر موتی بھی برسائے تو کیا
تلخ ہیں لمحے ترے
جب دل تمنائیں کرے

گوشہ ظفر علی خاں میں مولانا مرحوم کی بعض خصوصی عادات کا ذکر دلچسپ بھی ہے اور قابل توجہ بھی۔ مثلاً مولانا کا ورزش کے لیے مگدر ہلانا۔ جب دکن سے لوٹے تو مگدروں کی رنگین جوڑی بھی ساتھ لائے۔ لمبی سیریں اور سر راہ کسی مقامی نہر یا برساتی نالے کے پل کی پختہ منڈیر پر مغرب کی نماز کی ادائیگی۔ دکن میں اقامت کے دوران انتہائی جرأت سے کام لیتے ہوئے خدمت خلق کے جس بے لوث جذبے کے ماتحت اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انہوں نے ایک بچے کو اندھے کنویں سے نکالا تھا۔ اس سے متاثر ہو کر وہاں کے ایک خاندان نے اپنے دو بچوں کو تربیت کے لیے کرم آباد بھیج دیا تھا۔ جو دو سال یہاں بطور مہمان زیر تربیت رہے۔

اسی تربیت کے حوالے سے ان کی والدہ محترمہ کا ذکر ناگزیر ہے۔ غالب پر تحقیق کے دوران پروفیسر حمید احمد خاں دلی اور کلکتے میں اپنی ہر روز کی روداد باقاعدہ مرحومہ کی خدمت میں لکھ بھیجتے تھے۔ اس کی کنہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس گوشے میں اس خاتون کے ذکر سے پروفیسر صاحب کے عمل کا جواز واضح طور پر سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی کہ موصوفہ کس پائے کی خاتون تھیں۔

اس گوشے میں اپنے خاندان سے باہر بعض ہم عصر شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے کچھ ایسے نکات بیان کیے ہیں۔ جو عام طور پر معروف نہیں۔ مثلاً زمیندار کا روزانہ دو دفعہ شائع ہونا۔ اشاعت صبح اور اشاعت مسا۔ یہ شرف کسی اور اخبار کو ہمارے ہاں حاصل نہیں ہوا۔ سر راس مسعود کی پرورش۔ ماسٹر پیارے لال اور رام بابو سکسینہ کا باہمی رشتہ۔ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کا خاندانی تعلق، ٹیگور کی تصنیفات کی تفصیل، شیخ عبدالقادر کی انگریزی تصنیفات کا حوالہ۔ اثر صہبائی کی شاعری پر بھرپور تبصرہ وغیرہ۔

ان مضامین کو پڑھتے ہوئے ایک مضمون یاد آیا جہاں تک حافظہ ساتھ دیتا ہے۔ یہ بھی مولانا ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ تھا۔ اس میں ان دو شعروں کا واقعاتی پس منظر پیش کیا گیا تھا۔

کوئی برق پہلو سے ٹکرا گئی تھی　　مہینوں سلگتے رہے آشیانے

ہوا یوں کہ مال روڈ پر شاعر کسی اینگلو انڈین خاتون کے سائیکل سے ٹکرا گئے تھے۔ ان کے گھٹنے پر خاصی چوٹ آئی اور مہینوں صاحب فراش رہے۔ دوسرا شعر یوں ہے:

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے　　پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

اس شعر کی تخلیق کا باعث یہ واقعہ/حادثہ تھا کہ اسہال کے ایک مریض کرم آباد ایک رات مہمان رہے اور رات بھر مولانا کے مکان سے ملحقہ باغیچہ میں فراغت حاصل کرتے رہے۔ دوسرے شعر میں کرم آباد کا حوالہ بھی غالباً میری تائید کرتا ہے کہ مضمون مولانا ہی نے لکھا تھا۔

ایک خاص حصہ اس کتاب کا جو بہت دلچسپ ہے اس کا عنوان مرتبین نے نقوش مغرب رکھا ہے۔ اس گوشے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی ادب پر بھی مولانا گہری نظر رکھتے تھے۔ کیٹس Keats پر ان کا مضمون مختصر سہی لیکن اس کی دو مشہور نظموں کا جو ترجمہ انہوں نے پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے انگریزی زبان اور ادب کی تفہیم اور نکتہ دانی میں بھی انہیں خاصا درک تھا۔ حسن نسوانی کا ادبی مصور بھی اپنی نوعیت کا منفرد مضمون ہے۔ ورڈزورتھ پر ان کا مضمون اور نظم کا ترجمہ بھی بہت خوب ہیں۔

زبان دانی اور صحت زبان اس خاندان کا خاص وصف تھا۔ اس ضمن میں انہوں نے بہت سے الفاظ کے غلط العوام تلفظ کی نشاندہی کی ہے اور تلفظ کی تصحیح بھی کر دی ہے۔ خصوصاً اخبار نویسوں کے انگریزی الفاظ کے غلط ترجمے کی مثالیں بہت دلچسپ ہیں۔ اسی ذیل میں کاتبیات کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ کاتب حضرات کتابت کرتے وقت بعض اوقات دانستہ یا نادانستہ اصل عبارت میں کچھ ایسی تبدیلیاں کر دیتے تھے جو بعض اوقات مضحک صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ (کمپوزنگ کی غلطیاں اس کے برعکس کم علمی کا نتیجہ ہوتی ہیں) مولانا نے بعض ناگفتنی اصلاحات مثلاً نور کا تڑکا کا ذکر بھی کیا ہے لیکن اس شائستگی کے ساتھ کہ اس میں جو ذم کا پہلو نکلتا تھا اس کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے اور عبارت کی ثقاہت بھی برقرار رہتی ہے۔

غرض جس طرح میر نے دلی کے گلی کوچوں کو اوراقِ مصور کہا تھا اسی طرح یہ مضامین بھی ایک رنگا رنگ مرقع ہیں۔ بصیرت افروز بھی اور دلچسپ بھی۔ خدانکردہ اگر انہیں کتابی صورت میں یکجا نہ کر دیا جاتا اور یہ پرانے جرائد کے صفحات میں گم ہو جاتے تو اردو ادب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔

# اردو کی دو اہم آپ بیتیاں

ڈاکٹر انور محمود خالد

## گردِ راہ:

اردو ادب میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ایک نقاد، افسانہ نگار، مترجم اور مولف و مرتب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ''ادب اور انقلاب'' اور ''روشن مینار'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں۔ ''محبت اور نفرت'' اور ''زندگی کا میلہ'' نامی کتابوں میں ان کے افسانے جمع کیے گئے ہیں۔ انہوں نے کالی داس کے مشہور ڈرامے ''شکنتلا'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ''پیام شباب'' کے نام سے بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذر الاسلام کی نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے روسی ناول نگار گورکی کی آپ بیتی کا تین جلدوں میں ترجمہ بھی کیا جو (i) ''میرا بچپن'' (ii) ''روٹی کی تلاش'' اور (iii) ''جوانی کے دن'' کے ناموں سے شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے پرل سٹین بک کے معروف ناول ''گڈ ارتھ'' کا ترجمہ بھی ''پیاری زمین'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ترتیب و تالیف سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ چنانچہ ان کی مرتبہ کتابوں میں ''حبشہ و اطالیہ'' کے نام سے بھی ایک کتاب چھپ چکی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے ''مقالات گارساں دتاسی'' جلد دوم کے تین مقالے ترجمہ بھی کیے۔

''گردِ راہ'' انہیں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ ''اس کتاب میں، میں نے اپنے ماحول، مشاہدے اور مطالعے کا ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے صحیح معنوں میں یہ سوانح حیات نہیں بلکہ ایسی تحریر ہے جس میں آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔ محفل ادب سے طویل غیر حاضری کے بعد چند سال قبل اس کی طرف لوٹنے کی مہلت ملی تو حضرت صہبا کی فرمائش پر رسالہ ''افکار'' کے لیے ایک سلسلہ مضامین سپرد قلم ہوا۔ بات سے بات نکلتی گئی اور کتاب کا نقشہ ذہن میں ابھرا ہی تھا کہ بصارت کو، جو پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، ایک جراح کی نشتر زنی نے اس طرح متاثر کیا کہ قلم نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میری رفیقۂ حیات اور فرزندوں نے سہارا نہ دیا ہوتا تو کبھی کا جان سے گزر چکا ہوتا، تاہم اس پریشاں دماغی کی کیفیت میں کبھی کبھی خلش ہوتی رہی کہ کاش یہ ناتمام کتاب کسی طرح پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ اس کے لیے کسی علم کے شائق نویسندہ کے تعاون کی ضرورت تھی۔ پہلے فاتح فرخ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا لیکن وہ جلد ہی لاہور چلے گئے۔ پھر لیلیٰ خورشید سلمہا نے بڑے عزم و صبر سے باقی ماندہ حصے کو قلم بند کیا۔ خدا خدا کر کے مسودہ تیار ہوا تو صہبا صاحب نے طباعت و اشاعت کی ذمے داری سنبھالی اور آخری پروف دیکھنے کی زحمت ڈاکٹر جمیل جالبی نے گوارا فرمائی''۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا عالمانہ انکسار اپنی جگہ، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بقول صہبا لکھنوی:

''گردِراہ''۔ گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت سوانح عمری، علم وادب، تہذیب وفکر، سیاست وتمدن، سیروسیاحت، مشاہدہ مطالعہ اور عصری آگہی کی ایک ایسی جامع دستاویز ہے جس کی نظیر سوانح عمریوں کے سرمائے میں شاید ہی دستیاب ہو''۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ''گردِراہ'' کے ''حرف آغاز'' میں لکھتے ہیں کہ ''جب دن ڈھلنے لگتا ہے تو سامنے دھندلکا ہوتا ہے۔ وقت پیچھے رہ جاتا ہے اور ماضی، سائے کی طرح پاؤں سے لپٹ جاتا ہے۔ سولہ سال کی عمر میں علم کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا اور اب گردِراہ کو دامن سے جھٹکنے کی فرصت ملی ہے۔ ہر شخص عموماً اپنی ذات میں گم صم رہتا ہے۔ بہ ایں ہمہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر، وہ اپنے عہد اور ماحول سے بہت کچھ اخذ کرتا ہے۔ احباب کا تقاضا ہے کہ از سرِنو قلم اٹھاؤں اور اپنی سرگزشت لکھ ڈالوں۔ مجھے اس میں تامل ہے۔ میں طبعاً خلوت پسند ہوں اور دنیا کو راز داں بنانا مجھے پسند نہیں۔ البتہ دوسروں کی طرح میں بھی اپنے دور کا گواہ ہوں۔ اپنے مشاہدے اور مطالعے پر مجھے اعتبار ہے اور کئی ایسی تحریکوں اور شخصیتوں سے واسطہ پڑا جنہوں نے کسی نہ کسی طرح ماحول کو متاثر کیا۔ فطرت اور تاریخ سے دلچسپی نے کیا کیا تماشے دکھائے، مشرق اور مغرب کی کیسی کیسی سیاسی اور ثقافتی محفلوں سے روشناس ہوا اور فکر وعمل کے کیا کیا تجربے ہوئے، یہ تذکرہ خالی از لطف نہیں''۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی عملی زندگی کے تیس سال تعلیمی مشاغل میں صرف ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۲ء میں ایم اے او کالج، امرت سر کی پروفیسری سے شروع ہو کر ۱۹۷۲ء میں ختم ہوا۔ جب وہ اقوام متحدہ کے ادارہ یونسکو کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ اس دوران انہیں برطانوی حکومت ہند کے معاون مشیر تعلیم، پاکستان کے نائب مشیر تعلیم اور یونسکو کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت صومالیہ اور حکومت ایران کے مشیر تعلیم کے فرائض انجام دینے پڑے۔ اس دوران انہیں کئی تعمیری خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی ''گردِراہ'' کا آغاز، ان کی زندگی کے ابتدائی برسوں سے ہوتا ہے اور اختتام ایران، فلسطین، سپین، اطالیہ، امریکہ، جاپان اور چند دیگر ممالک میں گزارے ہوئے ایام کی بھولی بسری یادیں تازہ کرنے پر۔ وہ ۱۲ جون ۱۹۱۲ء کو صوبہ متوسط ہند کے شہر رائے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد، سید اکبر حسین کا تعلق پٹنہ کے ایک پرانے معزز خاندان سے تھا۔ اختر حسین تین سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا ۲۶ برس کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مظفر حسین شمیم، ان کے بڑے بھائی تھے جو بعدازاں ملک کے نامور صحافی بنے۔ دونوں بھائیوں کی عمر میں تین سال کا فرق تھا۔ اگرچہ دونوں بھائیوں کو والدہ کی طرف سے وراثت میں دو گاؤں اور شہر میں خاصی جائیداد ملی تھی جن کی آمدنی ان کی کفالت کے لیے کافی تھی لیکن والد کی مستقل غیر حاضری اور رشتے داروں کی روایتی چیرہ دستی کی وجہ سے وہ اس سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اختر حسین کو پہلے ایک دینی مدرسے میں داخل کرایا گیا لیکن مدرسے کے ناظم کے نامناسب رویے سے تنگ آ کر انہیں ہندی کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جس کی وجہ سے ہندی اور سنسکرت زبانوں میں ان کی استعداد بہتر ہوگئی۔ اردو زبان اور فارسی زبان انہوں نے اپنے بڑے بھائی سے پڑھی اور انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر انہوں نے بڑے ہو کر عبور حاصل کیا۔

میٹرک کرنے کے بعد جب انہوں نے کالج کی تعلیم کے لیے کلکتہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، جہاں ان کے بڑے بھائی مظفر حسین شمیم، روزنامہ ''عصر جدید'' سے وابستہ تھے تو ان کے والد نے ان کی مستقل مدد کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا، البتہ دو سو روپے دے کر کلکتہ جانے اور اپنے بل بوتے پر قسمت آزمائی کرنے کی اجازت دے دی۔

اپنے کلکتہ کے قیام کے زمانے میں انہیں وحشت کلکتوی، مولانا ابوالکلام آزاد، آغا حشر کاشمیری، چراغ حسن حسرت اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سمیت کئی نامور شخصیات سے ملنے کے مواقع ملے۔ کلکتہ ہی میں اپنی گزراوقات کے لیے انہوں نے ہندی زبان کے مقبول روزنامے ''وشوامتر'' اور مقتدر ماہنامے ''وشال بھارت'' میں مضامین لکھنے شروع کر دیے اور یہیں دو سالہ قیام کے دوران انہوں نے نہ صرف بنگلہ زبان سیکھی بلکہ ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام سمیت سب بڑے بنگالی ادیبوں کو جی بھر کر پڑھا اور یہ مطالعہ اتنا بڑھا کہ بعدازاں انہوں نے ان کی نظموں کے تراجم بھی کیے جو پہلے رسائل میں چھپے اور پھر کتابی شکل میں جمع ہوئے۔ کلکتہ میں ہی انہوں نے ایف اے کرنے کے بعد بی اے میں داخلہ لیا، لیکن سیاسی وجوہ سے انہیں ستمبر ۱۹۳۲ء میں، جب وہ بی اے کے پہلے زینے پر پہنچ چکے تھے، بادلِ ناخواستہ کلکتہ چھوڑنا پڑا اور وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔ ان ایام میں ان کا رابطہ حیات اللہ انصاری، سید سبط حسن، ساغر نظامی اور اسرارالحق مجاز سے ہوا، جنہوں نے آگے چل کر بالترتیب ناول نگاری، ادبی صحافت اور شاعری میں شہرت پائی لیکن درحقیقت اپنے قیام علی گڑھ کے زمانے میں جن نامور اساتذہ کی شخصیت کا ان پر دیرپا اثر ہوا، وہ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے۔ ایک نے انہیں تاریخ اور دوسرے نے انہیں کلاسیکی اردو ادب کا صحیح ذوق عطا کیا۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام ہی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی واقفیت ڈاکٹر ذاکر حسین، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی سے بڑھی جو تاحیات قائم رہی۔ علی گڑھ میں ان کے تین کٹھن سال اس طرح کٹے کہ گرمیوں کی طویل تعطیل کلکتہ میں بسر کرتے اور بیچ بیچ میں جب موقع ملتا، لاہور یا دہلی یا کسی اور مقام کی طرف نکل جاتے۔ اسی دور میں انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو اور علامہ اقبال سے اپنی پہلی پہلی ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔ حکومت کی مخالفت کے باوجود سر راس مسعود کے دورِ وائس چانسلری میں، اختر حسین نے بطور طالب علم لیڈر، پنڈت نہرو کو خطاب کے لیے پہلی بار علی گڑھ یونیورسٹی میں مدعو کیا۔ دلی میں ہی ان کی ملاقات علامہ اقبال سے پہلی بار ہوئی جب اتاترک کے پرانے رفیق رؤف بے، جامعہ ملیہ کی دعوت پر تشریف لائے اور ان کے جلسے کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ ڈاکٹر انصاری کی قیام گاہ پر وہ علامہ اقبال سے ملنے گئے اور ان کی بصیرت کا گہرا تاثر لے کر اٹھے۔ لاہور میں بھی چند بار وہ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بتاتے ہیں کہ ''آخری ملاقات ۱۹۳۶ء میں پانی پت میں مولانا حالی کی صد سالہ تقریب کے مشہور جلسے میں ہوئی جب میرا مقالہ ''ادب اور زندگی'' ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔ جب کسی نے میرا تعارف علامہ اقبال سے ان الفاظ میں کیا کہ یہ آپ کی شان میں سخن گسترانہ باتیں لکھ گئے ہیں تو انہوں نے کمال شفقت سے فرمایا: ''ایسے مخلص نوجوانوں کی میں قدر کرتا ہوں۔ بے جان لوگوں کے اتفاق پر، جان دار لوگوں کے اختلاف کو ترجیح دیتا ہوں''۔ آگے چل کر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اعتراف کرتے ہیں کہ ''اس وقت میں نے اقبال کا کلام جستہ جستہ پڑھا تھا۔ اب انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کی شاعری اور شخصیت کی عظمت کا اعتراف کروں۔ غم دوراں کا ایسا نوحہ خواں اور عظمتِ انساں کا ایسا قصیدہ خواں بیسویں صدی میں کوئی شاعر نہ ہوا''۔

علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں ہی ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی ملاقات پہلی بار بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ہوئی۔ وہ نوجوان اختر حسین کی لیاقت اور ذہانت اور مختلف زبانوں پر عالمانہ عبور سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں رسالہ ''اردو'' میں معاونت اور انگریزی ہندی لغت میں شرکت کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی اور حیدرآباد دکن، مولوی عبدالحق کے پاس پہنچ

گئے۔ یہ تعلق اتنا محکم ہوا کہ بابائے اردو نے انہیں اپنا بیٹا بنالیا اور ان کی حمیدہ بیگم سے شادی کرانے میں اہم رول ادا کیا جو پولیس کے ایک اعلیٰ افسر اور مشہور جاسوسی ناول لکھنے والے مصنف ظفر عمر کی صاحبزادی تھیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں:

''زیادہ نہیں، کچھ کم دو سال مجھے مولوی عبدالحق کے ساتھ حیدر آباد اور اورنگ آباد میں کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ مگر بوڑھے طالسطائی کو نوجوان گورکی نے جس غور سے دیکھا تھا، کچھ اسی انداز سے میں نے اس بزرگ شخصیت کو دیکھا..... اول جنگ عظیم سے دو سال قبل علی گڑھ سے انجمن ترقی اردو، ایک ٹوٹے ہوئے صندوق میں چند اوراق پریشاں کے ساتھ مولوی صاحب کے پاس اورنگ آباد پہنچی تھی۔ پھر انہوں نے اس نونہال کی پرورش خونِ جگر پلا کر جس طرح کی، اس کا ذکر اردو زبان کی تاریخ کا روشن باب ہے۔ انجمن کا دفتر، اشاعت گھر اور چھاپے خانے کے ساتھ یہیں رہا تا وقتیکہ ۱۹۳۸ء میں دہلی منتقل ہو گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب کو اردو سے ماں کی سی عقیدت اور انجمن سے بیٹی کی سی شفقت تھی۔ ان سے ہٹ کر انسانی تعلقات ان کے لیے بے معنی تھے''۔

حیدر آباد دکن کے قیام کے دوران ان کا تعارف مسز سروجنی نائڈو اور ان کے خانوادے سے بھی ہوا جن کا تذکرہ اختر حسین رائے پوری نے بڑی محبت اور احترام سے کیا ہے۔ گردِ راہ میں خالدہ ادیب خانم اور ان کے شوہر عدنان ان کے علاوہ بے انت بے شمار مشہور عالمی شخصیات کا بڑی عقیدت سے ذکر ہوا ہے لیکن ان سب کے سرتاج مولوی عبدالحق ہیں، جن کی تعریف کرتے ہوئے اختر حسین رائے پوری کا قلم کہیں نہیں تھکتا۔ ''گردِ راہ'' کے تیسرے ایڈیشن میں بیگم حمیدہ اختر حسین رائے پوری نے اپنے شوہر کی یاد میں ''بیادِ اختر'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں وہ بتاتی ہیں کہ:

> ''اختر کی شخصیت پر مولوی عبدالحق بابائے اردو کی چھاپ، ان کی روزمرہ زندگی میں ہر روز ہی نظر آتی رہی۔ زندگی کا ہر قدم سوچ کا اٹھانا، باقاعدہ صبح کی ہوا خوری، اس کے بعد ورزش کر کے ایک پیالی چائے پی کر تیار ہونا۔ ان کو اب جب کہ کہیں آنا جانا نہ تھا، مگر آٹھ بجے ٹھیک یوں تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آ جاتے تھے جیسے دفتر جانے والے ہیں۔ سہ پہر کو کپڑے بدل کر ریڈیو سنتے۔ ساڑھے چار بجے نہا کر تیار ہوتے۔ پانچ بجے کمرے سے نکل آتے۔ چائے پی کر لمبی سیر کر کے آتے ..... صبح ایک پیالی چائے مولوی صاحب کی طرح خود بناتے۔ نمک گرم پانی میں ڈال کر، صبح اور سوتے وقت غرارہ کرنا یہ عادت بھی مولوی صاحب کی عطا کردہ تھی۔ اس کے بعد ورزش۔ اس سے پہلے ہوا خوری۔ جانوروں اور پرندوں سے بے حد پیار کرتے۔ ان کے پالنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ طرح طرح کی چڑیاں، توتے، کبوتر، کتا، خرگوش رکھا کیے''.....

یوں لگتا ہے کہ مولوی عبدالحق ہر لحاظ سے ان کی آئیڈیل شخصیت تھی۔ سحر انصاری نے ٹھیک لکھا ہے کہ ''حمیدہ بھابھی نے ''بیادِ اختر'' میں جو واقعات لکھے ہیں، ان سے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شخصیت کے بہت سے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ ان کے معمولات، ان کی جائیداد و امارت سے بے زاری، انسان دوستی، موسیقی سے بے پایاں لگاؤ، بے انتہا قوی ارادہ اور حوصلہ، سیر چشمی، خودداری اور عزت نفس، دانشورانہ صلاحیتوں کا ایک سمندر اور بستر مرگ پر بھی نہ ملول، نہ دل برداشتہ۔ یہی ایک انسان کی پہچان ہے''۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت سوانح عمری ''گردِ راہ'' واقعی آپ بیتی کم اور جگ بیتی زیادہ ہے۔ بلکہ نصف سے زیادہ کتاب پر تو خودنوشت آپ بیتی سے زیادہ سفرنامے کا گمان گزرتا ہے۔ انہوں نے اپنی ذات، عادات و اطوار، پسند و

ناپسند اور دلچسپیوں کے بارے میں کم سے کم لکھا ہے اور دوسروں کی شخصیات کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا ہے۔ وہ بقول خود، طبعاً خلوت پسند ہیں اور دنیا کو راز داں بنانا پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس اعتراف، عالمانہ انکسار اور نفسیاتی دروں بینی کے باوجود ان کی ذاتی شخصیت کی جھلکیاں، مشاہیر کے تذکرے میں سے چھن چھن کر باہر آتی ہیں۔ انہوں نے ''گردِ راہ'' میں جن جن افراد کا عقیدت، والہانہ پن اور شیفتگی کے ساتھ ذکر کیا ہے، کیا ان کے پس پردہ خود مصنف کی شخصیت و کردار کے دلآویز پہلو جلوہ گر نہیں؟ یقیناً ہیں۔ یورپ میں قیام کے زمانے میں ان کی ملاقات خالدہ ادیب خانم اور ان کے شوہر عدنان بے کے ساتھ پیرس میں ہوتی ہے جو اتاترک سے نظریاتی اور سیاسی اختلاف کے بعد خود اختیار کردہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن ان کی حب الوطنی اور قومی وقار، ان کے ذاتی مصائب و آلام پر حاوی تھے اور وہ ترکی اور اتاترک کے خلاف، بیرون ملک، کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اسی طرح اختر حسین رائے پوری کی ملاقات لندن میں سر شیخ عبدالقادر سے ہوتی ہے جن کی شخصیت، کردار اور کارناموں کو مصنف نے دل کھول کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یورپ میں ان کا زیادہ تر قیام پیرس میں رہا جہاں کی سوربون یونیورسٹی سے وہ ''ہند قدیم کی زندگی۔ سنسکرت ادب کے آئینے میں'' کے موضوع پر ڈی لٹ کر رہے تھے لیکن تعطیلات میں وہ اردگرد کے یورپی ممالک کی سیر و سیاحت بھی کرتے رہے۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد وہ یورپ سے واپس ہندوستان لوٹ آئے اور یوں ان کی عملی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ''گردِ راہ'' کا ایک قابل ذکر حصہ ہندوستان میں جنگ آزادی کی تحریک، اس سے وابستہ مشہور سیاسی شخصیات کی سرگرمیوں اور قیام پاکستان کے بعد کے واقعات کے لیے وقف ہے لیکن اس قدرے طویل اور خشک تذکرے کو بھی انہوں نے جابجا اپنی پسندیدہ علمی و ادبی شخصیات کے ذکر دل پذیر سے رنگین بنایا ہے۔ چنانچہ ن م راشد، سعادت حسن منٹو اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا تذکرہ سپاٹ سیاسی اور ٹھوس تاریخی واقعات میں رنگ بھرتا ہے اور ''گردِ راہ'' کو نہ صرف قابل مطالعہ بلکہ دلچسپ کتاب بنانے میں مدد کرتا ہے۔ مجنوں گورکھ پوری ٹھیک کہتے ہیں کہ ''گردِ راہ'' آپ بیتی کے پیرائے میں دراصل پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کی ادبی، تہذیبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کی زندہ دستاویز ہے اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام ہی اس کے مستند اور معتبر ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ وہ راہی بھی رہے ہیں اور راہبر بھی۔ ان کی یہ کتاب بھی ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے سنجیدہ حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی''۔

## یادوں کی دنیا:

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اردو دنیا میں اپنی کتابوں ''روح اقبال''، ''اردو غزل''، حافظ اور اقبال''، ''فرانسیسی ادب'' اور ''غالب اور آہنگ غالب'' کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی آپ بیتی ''یادوں کی دنیا'' نے نہ صرف ہمیں ان کی اپنی ذات کے اندر جھانکنے کا ایک نادر موقع فراہم کیا ہے بلکہ معاصرین اور قریبی اعزا و احباب کے بارے میں سچی، کھری اور دیانت دارانہ آرا دینے کی وجہ سے اپنی عزت و شہرت میں مزید اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''عالمی ادب میں آپ بیتی لکھنا، ادیبوں کا دلچسپ مشغلہ

رہا ہے..... آپ بیتی زندگی کی تاریخ بھی ہے اور ماورائے تاریخ بھی۔ حافظے کو کھنگالنے سے زندگی کی جو تصویر سامنے آتی ہے، اس میں ایک طرح کی طلسمی خاصیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ کہانی کہنے والا اپنے فن کے آداب کو برتنا جانتا ہو..... آپ بیتی میں تاریخ کے برخلاف فرد کی کہانی، موضوع ہوتا ہے۔ اس کے دل کی، دماغ کی، عمل کی کہانی، لیکن یہ کہانی معمولی قسم کی کہانی سے الگ ہوتی ہے۔ اس واسطے کہ اس میں جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں افراد کی شخصیت کو از سر نو تخلیق کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے والے اور مورخ میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں صداقت کی روشنی میں اپنا قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ آپ بیتی لکھنے والا ناول نویس کی طرح آرٹ کی تخلیق کرتا ہے..... دونوں انسانی شخصیت کی پیچیدگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور سادہ اور من مانے اصول کے ذریعے اس کی توجیہ نہیں کرتے۔ دونوں ان صداقتوں کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں جن کا علم سچی انسان دوستی کے لیے ضروری ہے۔ دونوں ادعا پسندی سے احتراز کرتے ہیں''۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۱۸ ستمبر ۱۹۰۲ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور ۲۱ فروری ۱۹۷۹ء کو دہلی میں فوت ہوئے۔ یوں انہوں نے لگ بھگ ساڑھے چھہتر برس کی عمر پائی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے دسمبر ۱۹۶۵ء میں ''یادوں کی دنیا'' کو لکھنا شروع کیا اور تقریباً ایک سال کی مدت میں اسے ختم کیا۔ آپ بیتی لکھتے وقت ان کی عمر ۶۴ برس تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر یوسف حسین خاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پرووائس چانسلری سے مستعفی ہو کر دلی آ گئے تھے۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ ''اس آپ بیتی میں کچھ واقعات خاندانی بزرگوں سے منقول ہیں، کچھ میں نے حافظے سے لکھے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کی یادداشتیں میرے پاس موجود تھیں۔ مجھے روزنامچہ لکھنے کا شوق رہا ہے لیکن پابندی سے نہیں۔ تاہم اس سے بڑی مدد ملی۔ اقوال جہاں بھی نقل کیے ہیں ان کی اصلی ماخذوں سے جانچ کر لی ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں سے عبارتیں نقل کی ہیں ان کے حوالے دے دیے ہیں۔ جہاں تک ہو سکا، واقعات کو بے کم و کاست بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نہ کسی کو اچھالنا مقصود ہے اور نہ کسی کو خواہ مخواہ گرانا۔ اپنی ذاتی کوتاہیوں کو بھی نمایاں کر دیا ہے۔ اس لیے کہ بغیر احتساب نفس کے، حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ انسان دوستی، ادب کی دائمی قدر ہے۔ اس میں اپنے نفس اور اپنی کوتاہیوں کا تجزیہ شامل ہے۔ اس کے بغیر دوسروں کی زندگی کا تجزیہ کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا''۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولوی فدا حسین خاں اور نازنین بیگم کے سات بیٹوں میں پانچویں نمبر پر تھے۔ ماں باپ کا سایہ بچپن ہی میں ان کے سر سے اٹھ گیا تھا اور ان کے تین بھائی بھی کم عمری میں فوت ہوئے۔ زندہ رہنے والے چار بھائیوں میں سے تین نے تعلیمی، علمی، ادبی اور سیاسی میدانوں میں بہت شہرت پائی۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خان جامعہ ملیہ دہلی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، صوبہ بہار کے گورنر اور بھارت کے نائب صدر اور بعد ازاں صدر کے عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین خان ڈھاکہ یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور مرکزی وزیر رہے۔ خود ڈاکٹر یوسف حسین خاں پہلے جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن میں صدر شعبہ تاریخ اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ تینوں بھائیوں نے تصنیف و تالیف و ترجمہ کے میدانوں میں بھی نام پیدا کیا۔ چنانچہ

ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے افلاطون کی کتاب ''ریاست'' اور ڈاکٹر محمود حسین خان نے میکیاولی کی کتاب ''بادشاہ'' کا اردو ترجمہ بھی کیا اور تعلیمی موضوعات پر باقاعدہ کتابیں اور مقالے بھی لکھے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو سیاست اور انتظامی امور سے زیادہ علم و ادب سے دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تصنیف و تالیف اور ترجمہ و تدوین کی دنیا میں وہ اپنے دونوں نامور بھائیوں سے بازی لے گئے۔ ان کا تصنیفی سرمایہ اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ گراں قدر اور دیرپا ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی جن کتابوں کا ابتدا میں ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاوہ ''کاروانِ فکر'' غالبؔ اور اقبالؔ کی متحرک جمالیات'' اور ''حسرت کی شاعری'' جیسی ان کی نسبتہً مختصر تصانیف بھی قدر و قیمت کے اعتبار سے کم نہیں ہیں۔ تینوں بھائیوں کی ہمہ جہت علمی، ادبی، تعلیمی، سیاسی اور انتظامی کارناموں کو دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ خاندان ''ہمہ آفتاب'' ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان، آپ بیتی کو فرد کے دل کی، دماغ کی، عمل کی کہانی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ''یادوں کی دنیا'' دل سے زیادہ دماغ اور عمل کی کہانی ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

لیکن ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی آپ بیتی لکھتے وقت کہیں بھی دل کو تنہا نہیں چھوڑا۔ ان کے دل کی لگامیں ہمیشہ پاستان عقل کے ہاتھ میں رہتی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں پہلی مرتبہ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہونے والی آٹھ ابواب اور ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل آپ بیتی ''یادوں کی دنیا'' میں وہ سب کچھ موجود ہے، جس کی آپ کسی بھی اچھی آپ بیتی سے توقع رکھتے ہیں لیکن ان چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے جو کسی خود نوشت کو قارئین کے لیے چٹخارے دار غذا بنا دیتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آپ بیتی وجودِ زن کے اس تذکرے سے خالی ہے جس سے تصویرِ کائنات میں رنگ بھرتا ہے۔ اپنے قیام یورپ کے زمانے میں وہ فرانسیسی، جرمن، اطالوی، ہسپانوی اور انگریز نوجوان عورتوں کو دیکھتے ہیں اور ان کے حسن و جمال، غمزہ و ادا، شوخی و بے باکی، شگفتگی و بے تکلفی، زندہ دلی و آزادہ روی اور رنگینی و رعنائی کا متعدد جگہ لطف انگیز تذکرہ کرتے ہیں لیکن خود کہیں بھی 'بے خود' نہیں ہوتے۔ ''یادوں کی دنیا'' میں غالبؔ کے اس خط کا حوالہ دیتے ہوئے، جس میں انہوں نے اپنے مرشد کامل کے الفاظ میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو تلقین کی تھی کہ ''مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو''۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں کہ ''یورپ کے قیام کے زمانے میں میرا عمل بھی غالب کے مرشد کامل کی نصیحت پر رہا۔ میں زہد و تقویٰ کا نہ کبھی دعوے دار تھا اور نہ ہوں۔ ہاں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ گناہ کی خلش محسوس نہ کی ہو اور توفیق عمل کی دعا نہ کی ہو۔ معصیت کو ہمیشہ معصیت سمجھا اور ایسا کبھی نہ ہوا کہ اچھے برے کا امتیاز مٹ گیا ہو۔ یہی چیز تھی جس نے مجھے بہت سی برائیوں سے بچایا اور مجھے کبھی ایسا ملوث نہ ہونے دیا کہ میں گناہ کی دلدل میں پھنسا رہ جاتا۔ یہ اخلاقی ارادہ جو مذہب کا تحفہ ہے، مجھے ہمیشہ نیچے سے اوپر لے گیا اور میرے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دے کر زیادہ دنوں تک ادھر سے ادھر بھٹکنے نہیں دیا''۔

# ٹی اینڈ ٹی پبلشرز کی چار کتابیں

فرح ہارون

ٹی اینڈ ٹی پبلشرز لاہور ایک کمرشل اشاعتی ادارہ ہے جس کے روح رواں عرفان احمد خان ایک متحرک ادیب ہیں۔ ادارے کا قیام ۱۹۹۷ء میں عمل میں آیا۔ شروع میں اس سے عرفان احمد خان کے اپنے تخلیق کردہ ناول شائع ہوئے۔ جن میں ''آدھی روٹی کافی ہے''، گزارہ ایسے ہوتا ہے'' اور ''سنگ چور'' وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں خوشونت سنگھ کے ناولوں ''دلی'' اور ''ٹرین ٹو پاکستان'' کے تراجم، افتخار نسیم کی شاعری اور افسانوں کے مجموعوں ''آبدوز'' اور ''شبری'' کے علاوہ شہاب نامہ پر تنقید ''شہاب نامہ کی حقیقت'' اور ''شہاب بے نقاب'' بھی اسی ادارے سے چھپیں۔ اب تک یہ اشاعتی ادارہ ۲۵ سے زائد کتب طبع کر چکا ہے۔ ذیل میں چار نئی کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

## ٹرین ٹو پاکستان (ناول)

ناول نگار: خشونت سنگھ، مترجم: عرفان احمد خان، سال اشاعت: ۲۰۰۴ء، قیمت: ۱۰۰/- روپے، صفحات: ۲۰۰

ٹرین ٹو پاکستان معروف بھارتی ادیب خشونت سنگھ کے اسی عنوان کے انگریزی ناول کا ترجمہ ہے۔ اس ناول کے مترجم عرفان احمد خان ہیں جو اس سے پہلے خشونت سنگھ کے ناول ''دلی'' اور جین ساس کے ناول ''پرنسس'' کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔

ٹرین ٹو پاکستان ۱۹۴۷ء کے پس منظر میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کے دوران انڈو پاک سرحد پر واقع ایک گاؤں منوجرہ کی داستان ہے جہاں کی سکھ اکثریت مسلم اقلیت کے ساتھ پرامن طریقے سے رہ رہی ہوتی ہے لیکن انہیں پرامن نہیں رہنے دیا جاتا۔ مقامی بنیے کا قتل ہو جاتا ہے۔ پل پر سے ایک ٹرین معمول سے ہٹ کر آتی جو مسلمانوں کی کٹی پٹی لاشوں سے بھری ہوتی ہے۔ پھر چند دنوں بعد ایک اور ٹرین سرحدی پل سے گزرتی ہے جو مردہ سکھوں سے اٹی ہوتی ہے۔ منوجرہ میں بھی خون ابلنے لگتے ہیں، پاکستان جانے والی ٹرین کو کاٹنے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے جسے گاؤں کا دس نمبری بدمعاش جگت سنگھ عرف جگا نا کام بنا دیتا ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے جگے اور اقبال سنگھ کے کردار مہارت سے تخلیق کیے گئے ہیں۔ کرافٹ کے اعتبار سے بھی ناول کو اچھی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ ''ٹرین ٹو پاکستان'' کوئی نیا ناول نہیں ہے۔ بقول مترجم ''یہ خشونت سنگھ کا پہلا ناول ہے''۔ یہ ناول متعدد بار اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس پر فلم بھی بن چکی ہے لیکن عرفان احمد خان کا ترجمہ قاری کو نیا مزہ دیتا ہے۔ مترجم نے کوشش کی ہے کہ ناول نگار نے مشرقی پنجاب کی جس زبان کے اسلوب کو انگریزی میں پیش کیا ہے وہی اسلوب اردو ترجمے میں بھی برقرار رکھا جائے اور مترجم اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب ہیں۔ ''ٹرین ٹو پاکستان'' پڑھ کر احمد بشیر کے سوانحی ناول ''دل بھٹکے گا'' کا خیال بھی آتا ہے۔ جس میں کم و بیش اسی قسم کے واقعات ایمن آباد کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ اگرچہ ''دل بھٹکے گا''

بہت بعد میں چھپا ہے لیکن ان واقعات کی تصدیق ممتاز مفتی کی بہت پہلے کی تصنیفات سے ہو جاتی ہے۔
سلیقے سے طبع شدہ ترجمے کے واحد تقسیم کار دعا پبلی کیشنز ۲۵ سی لوئر مال لاہور ہیں۔

## کتنے پاکستان (ناول)

ناول نگار: کملیشور، مترجم: خورشید عالم، سال اشاعت: ۲۰۰۴ء، قیمت: ۳۵۰/- روپے، صفحات: ۳۸۴

''کتنے پاکستان'' ہندی فکشن رائٹر کملیشور کا ناول ہے جسے خورشید عالم نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کملیشور کے ۹ ہندی افسانوں کے مجموعے اور ۱۱ ہندی ناول چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ۵ فیچر فلمیں اور ۵۰۰ ٹیلی وژن ڈرامے بھی تحریر کر چکے ہیں۔ ''کتنے پاکستان'' ان کا تازہ ہندی ناول ہے جو تیکنیک کے اعتبار سے دنیا کے کسی بھی زبان کے فکشن کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہیرو، عظیم ہیرو اور ولن وقت ہے۔ ناول میں مصنف نے بہت سے سوالات بھی اٹھائے ہیں۔ جن میں کچھ کا جواب دیا جا سکتا ہے اور کچھ مزید سوالات پیدا کرتے ہیں۔

کملیشور نے زمانی موتاج (Time Montage) کا استعمال کر کے ماضی اور حال کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس ناول کا ہیرو وقت ہے لیکن بہت سارے کردار آتے ہیں اپنا رول ادا کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دو مستقل کردار ادیب اور محمود کے ہیں۔ ادیب کی عدالت لگتی ہے تو کٹہرے میں بابر، اکبر، شاہ جہاں، اورنگ زیب، دارا شکوہ، شبلی نعمانی اور بہت سی زندہ و جاوید ہستیاں کھڑی نظر آتی ہیں۔ ناول نگار ست جگ سے اپنی داستان شروع کرتا ہے اور اس عہد سے ہمارے آج کے عہد تک یہ کہانی چلتی رہتی ہے اس دوران بہت سارے مناظر، مقامات، ممالک، اماکن اور اشخاص آتے ہیں، گویا ایک ریل سی آنکھوں کے سامنے چلنے لگتی ہے اور قاری تاریخ کے اس حصے کا گواہ بن جاتا ہے۔

ناول نگار کے تجربے سے بعض مقامات پر اتفاق مشکل ہے۔ اگر تاریخ عالم کا مطالعہ کیا جائے تو قوموں کا عروج و زوال، سرحدوں میں تبدیلیاں، ملکوں کا بننا اور ٹوٹنا یہ سب فطری عمل ہیں۔ ناول نگار اس سے متفق نظر نہیں آتے۔ البتہ مصنف کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ نفرت، جنگیں اور خوں ریزی بہر حال تاریخ انسانی کا تاریک ترین پہلو ہے۔ کرافٹ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو میں اس پائے کا ایک ہی ناول ہے 'آگ کا دریا'۔ اس کے علاوہ یہ ناول پڑھتے ہوئے ڈاکٹر احسن فاروقی کا 'سنگم' بھی ذہن میں آتا ہے۔ ناول کی تکنیک اور کرافٹ کے مطالعے کے لیے ادب کے طالب علموں کو ''کتنے پاکستان'' ضرور پڑھنا چاہیے۔ ہم مترجم خورشید عالم کے فن کی بھی تعریف کریں گے کہ انہوں نے اپنا کام اس خوبی سے سرانجام دیا ہے۔

## خمار الفت (شعری مجموعہ)

شاعر: شاد آروی، سال اشاعت: ۲۰۰۴، قیمت ۱۵۰/- روپے، صفحات: ۱۹۲

شاد آروی کا اصل نام سید غلام فخر الدین تھا اور شاد تخلص کیا کرتے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ عربی اور فارسی زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ زبان و بیان پر یہ قدرت ان کے کلام سے بھی ظاہر ہے۔ 'خمار الفت' ان کا واحد مجموعہ کلام ہے جو ان کی وفات کے ۲۱ برس کے بعد شائع ہوا ہے۔

شاد آروی کا تذکرہ مسلم شعرائے بہار مولفہ کلیم سید احمد اللہ ندوی (حصہ ششم) اور کتابچہ ''متاع سخن'' ناشر حلقہ ارباب

آرہ میں بھی چھپا ہے۔ 'خمار الفت' اردو غزلوں، فارسی غزل، اردو نظموں اور فارسی نظموں سے سجا خوبصورت گلدستہ ہے جو دیکھنے میں تو خوشنما ہے ہی اس کے مطالعے سے بھی بھینی بھینی خوشبو ذوق طبع کی تسکین کرتی ہے۔

شاعر کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے۔ ان کا شمار رومانی تحریک سے وابستہ شعرا میں ہوتا تھا۔ اگر چہ شاد آروی کے موضوعات اور اسالیب میں جدت نہیں ہے پھر بھی ان کی شاعری رفعت خیال، الفاظ کے خوبصورت چناؤ، تغزل اور شعریت سے مملو قرار دی جاسکتی ہے۔

نمونہ کلام:

مرے گلستانِ حیات میں نہیں فصل عیش و شگفتگی
مری مختصر سی بیاض دل غم دو جہاں کی کتاب ہے

======

ترے فرشتے ہیں اس کے کاتب انہیں سے کر پرسش بھی اس کی
کبھی مطالعے میں میرے یا رب مری کتاب عمل رہی ہے؟

======

میں نے چکھا ہی نہیں ہوش کے جانے کا مزہ
بھول کر مجھ سے کبھی آنکھ ملائی ہوتی

======

وہ جو آپڑے ہیں سرے لحد تو ہجوم غیر سے الاماں
ہے گماں عرصۂ حشر کا مجھے شادؔ اپنے مزار پر

بہت عمدہ کاغذ پر خوبصورت سرورق کے ساتھ طبع شدہ اس شعری مجموعہ میں فہرست مندرجات کی عدم دستیابی قاری پر اچھا تاثر نہیں چھوڑتی۔ 'خمار الفت' کے ڈسٹری بیوٹر 'کتاب سرائے' فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ہیں۔

## اردو کی آخری مکمل کتاب (پارٹ ٹو)

مصنف: عرفان احمد خان، سال اشاعت: ۲۰۰۴ء، قیمت۔/۱۰۰ روپے، صفحات: ۱۴۴

عرفان احمد خان کی وجہ شہرت ایک ناول نگار کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے ترجمہ نگار بھی ہیں۔ گزشتہ سال انہوں نے مزاح نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور ان کی مزاح کی پہلی کتاب ''اردو کی آخری مکمل کتاب'' شائع ہوئی۔ ۲۰۰۴ء میں اس کتاب کا پارٹ ٹو بھی آ گیا ہے۔

'اردو کی آخری مکمل کتاب' (پارٹ ٹو) اس کتاب پارٹ ون کا ہی تسلسل ہے۔ کتاب کا ڈھانچہ ابن انشا کی کتاب 'اردو کی آخری کتاب' جیسا ہے۔ خود پارٹ ون میں مصنف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ موجودہ کتاب کا ڈھانچہ اور اسلوب انہیں ابن انشا کی مذکورہ کتاب ہی سے ملا تھا۔

پارٹ ٹو میں چند خاصے کی چیزیں ہیں جن میں 'کتابوں کی اقسام'، 'درخواست برائے امریکن ویزا'، 'انڈین گانوں کے

ذریعے قانون سازی'، 'مثالی پولیس اسٹیشن' اور 'پاکستان کی غیر روایتی کھیلیں' شامل ہیں۔

عرفان احمد خان مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار نظر آتے ہیں۔ کچھ مقامات پر ان کا انحصار 'سینہ گزٹ' پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ البتہ بعض جگہوں پر خوبصورت طنز ادبی شہ پارہ بن جاتی ہے۔ 'پاکستان کی غیر روایتی کھیلیں' کے ضمن میں 'ٹانگ کھینچنا' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''یہ کھیل ہمارے ملک میں نہ صرف بہت مقبول ہے بلکہ اس کے عالمی مقابلے ہوں تو پاکستان وکٹری سٹینڈ پر کھڑا نظر آئے گا۔ یہ کھیل عموماً نچلے سٹاف اور افسروں سے کھیلا جاتا ہے اور اس کا سیزن عموماً جون یا دسمبر (ترقیوں کے مہینے) میں شروع ہوتا ہے اور اسی ماہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کھیل میں کامیاب ہونے والے کو ڈبل انکریمنٹ یا اگلے گریڈ میں ترقی ملتی ہے''۔ ص ۱۱۱

ہوسکتا ہے عرفان احمد خان کو طنز و مزاح نگاری میں زیادہ مزہ آ رہا ہو کیونکہ بہت کم وقفے سے ان کی طنز و مزاح کی کتاب کا دوسرا حصہ آ گیا ہے ہمارے نزدیک ناول نگار عرفان احمد خان کا فن، طنز و مزاح نگار عرفان احمد خان کے فن سے ایک درجہ اونچا ہے۔ اس لیے اگر وہ ناول نگاری پر زیادہ توجہ کریں تو اس صنف میں اور آگے جا سکتے ہیں۔

اردو کی آخری مکمل کتاب پارٹ ٹو کے کے واحد تقسیم کار دعا پبلی کیشنز ۲۵ سی لوئر مال لاہور ہیں۔


## قائداعظم لائبریری کی مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ ابتدائی فلکیات | خالد مسعود | -/20 روپے |
| ۲۔ پودوں کی زندگی | خالد مسعود | -/30 روپے |
| ۳۔ مسلمان اور سائنس | خالد مسعود | -/30 روپے |
| ۴۔ عالم حیوانات | خالد مسعود | -/20 روپے |
| ۵۔ کرہ زمین | خالد مسعود | -/20 روپے |
| ۶۔ کلیاں میرے گلشن کی | عبدالرحمٰن خالد | -/20 روپے |
| ۷۔ اصطلاحاتِ حدیث | محمد سعد صدیقی | -/80 روپے |
| ۸۔ علم حدیث اور پاکستان میں اس کی خدمت | محمد سعد صدیقی | -/100 روپے |
| ۹۔ اسلامی آداب | سید عبدالرحمٰن بخاری | -/100 روپے |
| ۱۰۔ اسلامی قانون کا نظریہ مصلحت | سید عبدالرحمٰن بخاری | -/190 روپے |

**ملنے کا پتا: قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور۔ پاکستان**

# مصورانہ خطاطی۔ بیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک

اسلم کمال

مصوری کی تاریخ میں سب سے بڑی تحریک تاثریت (Impressionism) کا سرکاری یا متفقہ سال پیدائش ۱۸۷۴ء تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اسلامی فن خطاطی کی تاریخ کی عظیم ترین انقلابی تحریک مصورانہ خطاطی (Calligraphic Paintings) بھی جدید مغربی مصوری کے شانہ بشانہ اپنے آپ کو اس کا ہم مرتبہ ثابت کرنے کے لیے پوری ایک صدی بعد نمائش گاہوں میں قدم رکھتی دکھائی دیتی ہے۔ صادقین نے اپنے مخصوص انداز میں قرآنِ پاک کی سورہ رحمان کی مصورانہ خطاطی پر مشتمل ایک مختصر لیکن دیدہ زیب البم شائع کر کے لوگوں کی توجہ حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے اہل پاکستان کے لیے ہولناک نتائج کی پیدا کردہ اجتماعی بے چینی اور دل گرفتگی میں بہت کچھ دھندلا کر رہ گیا۔ ''جنگی قیدی کے نام'' مجید امجد کی ایک نظم روزنامہ ''امروز'' میں اسلم کمال کے ایجاد کردہ تازہ اسلوب خطاطی میں شائع ہوئی۔ اس نے علمی ادبی حلقوں کو خاص طور پر متوجہ کیا۔ وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے قرآنی آیت ''وتعز من تشاء وتذل من تشاء'' کا طغرا صادقین سے لکھوایا اور شملہ معاہدہ پر اندرا گاندھی کو پیش کیا۔

شاکر علی نے پاکستان ایٹمی انرجی کمیشن اسلام آباد کی عمارت میں آیت الکرسی پر مصورانہ خطاطی کا دوسرا میورل پینٹ کیا۔ ۱۹۷۳ء میں پاکستان میں مصورانہ خطاطی کی پہلی نمائش لاہور عجائب گھر میں ہوئی اور یہ اعزاز صادقین نے حاصل کیا۔ لیکن مصورانہ خطاطی کے ان فن پاروں میں خطاطی کے انداز کو روایتی خطاطین نے بے ہنری سے تعبیر کیا۔ نیشنل سنٹر الفلاح لاہور میں ایک مناظرہ نما اجتماع ہوا جس میں خطاطین اور فن خطاطی کا علم اور ذوق رکھنے والے اصحاب کے مابین گرما گرم تبادلۂ خیالات ہوا۔

شاکر علی نے فرسٹ سٹی بنک لاہور کے لیے ایک مصورانہ خطاطی 4x4 فٹ میں پینٹ کی۔ کراچی میں آذر زوبی نے کچھ کینوس مصورانہ خطاطی کے پینٹ کیے۔ لیکن نمائش نہ ہو سکی۔ البتہ شفیع عقیل نے کچھ تصاویر روزنامہ جنگ میں شائع کیں۔

مصورانہ خطاطی کی دوسری نمائش الحمرا آرٹس کونسل میں ۱۹۷۴ء میں ہوئی اور یہ اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کے فن پاروں کی پہلی نمائش تھی۔ یہ نمائش پورا ایک ماہ جاری رہی۔ اس کا افتتاح کرتے ہوئے ''آواز دوست'' کے مصنف جناب مختار مسعود نے کہا۔ ''اسلم کمال کو اپنے فن کی نمائش کے لیے کسی گیلری کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر ایک مارکیٹ ہر ایک بازار اور ہر ایک ریلوے اسٹیشن کے بک سٹالوں پر اسلم کمال کے تخلیق کردہ کتابوں اور رسالوں کے سرورقوں پر ان کی مصوری اور مصورانہ خطاطی کی نمائش ہر وقت لگی رہتی ہے''۔

انتظار حسین روزنامہ مشرق میں بعنوان ''لاہور نامہ'' ایک کالم لکھتے تھے۔ علمی، ادبی اور ثقافتی حلقوں میں اس کالم کا یوں

طوطی بولتا تھا کہ ادیب شاعر اور مصور اس میں اپنے ذکر کی تمنا کرتے تھے۔ جن دو مصوروں کا ذکر زیادہ ہوتا تھا وہ ایک شاکر علی اور دوسرے صادقین تھے۔ شاکر علی نے مصورانہ خطاطی کے ساتھ اپنی دلچسپی محدود رکھی۔ چنانچہ صادقین کی شخصیت کا سحر طاری کرنے اور اس کے فن کا سکہ بٹھانے میں اس کالم کا بڑا حصہ ہے۔ اسی کالم میں انتظار حسین اوپر بیان کردہ نمائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو کی اشاعتی دنیا میں سرورق پر چار دور گزرے ہیں۔ پہلا دور نولکشور کی مطبوعات کا ہے۔ جب کتاب کے سرورق پر بہت مینا کاری ہوتی تھی۔ ایک وقت آیا کہ اس مینا کاری سے جی بھر گیا۔ معارف اور مخزن جیسے پرچوں نے سپاٹ سرورق کی طرح ڈالی۔ نہ آرائش نہ زیبائش، کتاب اور رسالے کا نام لکھا اور پیش کر دیا۔ پھر اس سادگی سے بھی جی بھر گیا۔ اب سرورق چغتائی آرٹ سے مزین ہونے لگے۔ پھر اس کے خلاف بھی ردعمل ہوا۔ یہ سرورق کا چوتھا دور ہے جس میں چغتائی آرٹ سے منحرف ہو کر تجریدی مصوری والے سرورق بن رہے ہیں۔ مختار مسعود نے اس دور کا سہرا اسلم کمال کے سر باندھا''۔

''لباس کا استعارہ لے کر مختار مسعود نے یہ مضمون یوں باندھا کہ نولکشور کے زمانے میں کتابوں کو خلعت پہنائی جاتی تھی۔ معارف اور مخزن کا زمانہ سفید پوشی کا زمانہ تھا۔ چغتائی صاحب نے کتاب کو قبا پہنائی۔ اسلم کمال نے قبا اتار کر نئے فیشن کا لباس کتاب کو پہنا دیا''۔

''خطاطی میں ایک روایت سے بغاوت کا سہرا اسلم کمال کے سر بندھ گیا۔ سرورق میں وہ چغتائی آرٹ کے باغی ٹھہرے، یہاں صادقین کی خطاطی سے بغاوت کرنے والے قرار پائے''۔ (روزنامہ مشرق فروری ۱۹۷۵ء)

جناب احمد ندیم قاسمی روزنامہ جنگ کراچی میں اپنے کالم ''لاہور لاہور ہے'' میں لکھتے ہیں:۔

''تصویریں بنانے یا خطاطی کرنے کے میدان میں صادقین کا کوئی جواب نہیں۔ اس برق رفتاری کے باوجود ان کا ایک اپنا اور قطعی اسلوب ہے جو نا قابل تقلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لکھا ہوا ایک حرف بھی دور سے پہچانا جاتا ہے کہ یہ صادقین نے لکھا ہے یا صادقین کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔ اس ماحول میں اسلم کمال کا خطاطی کی طرف متوجہ ہونا اور اہل نظر کو اپنی طرف متوجہ کر لینا ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ خطاطی کو مصوری کا ایک شعبہ جان کر حروف کو ایک منفرد اور ساتھ ہی منظم صورت دینا اور لکھائی میں ضبط اور ڈسپلن۔ ایک باقاعدگی پیدا کر کے اسے ایک فن پارہ بنا دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ پھر اسلم کمال نے یہ عبارتیں محض لکھی نہیں ہیں بلکہ مصور کی ہیں۔ ان کے یہ تمام کینوس ایسی پینٹنگز ہیں جن میں عربی کے یہ الفاظ ان کو سمجھنے کے لیے کلید کا کام دیتے ہیں''۔ (اقتباس۔ روزنامہ جنگ کراچی، فروری ۱۹۷۵ء)

ابن انشاء اپنے کالم ''باتیں انشا جی کی'' ''اخبار جہاں'' کراچی ۱۹۷۵ء میں لکھتے ہیں:۔

''آخر میں اپنے دوست اور باکمال مصور اسلم کمال کا بھی ذکر جن کی خطی مصوری یا تصویری خطاطی کی نمائش آج کل لاہور میں لگی ہوئی ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ صاحب اسلوب آدمی ہیں شاعر ہیں۔ تحریر کے بھی تصویر کے بھی۔ آیات کریمہ کو آرٹ کا پیرہن صادقین نے دیا۔ رشید احمد ارشد نے دیا، شاکر علی نے دیا ہے، حنیف رامے نے دیا ہے۔ لیکن سب کا پیرایہ الگ الگ ہے۔ مثلاً صادقین کے ہاں گولائیاں بہت ہے۔ اسلم کمال کے ہاں زاویے مثلثیں اور مربع۔ ان کو خطوطِ مستقیم کا خطاط کہہ سکتے ہیں، ان کو صراط مستقیم کا آرٹسٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال ان کا فن شگفتگی اور رعنائی لیے ہوئے ہے اور ان کو فن میں حسن و خوبی کا

بہت خیال رہتا ہے۔ یہ بات بدقسمتی سے ہماری بدقسمتی سے ان کے تمام ہم عصروں کے باب میں نہیں کہی جا سکتی''۔

نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر خالد سعید بٹ اسلام آباد سے اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی دیکھنے لاہور آیا اور اپنے ماتحت غلام رسول کو ان فن پاروں کی نمائش کا جلد از جلد لیاقت میموریل ہال راولپنڈی میں انتظام کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ جون کی تیز گرمی میں راولپنڈی میں یہ نمائش ہوئی۔

عبدالواحد نادر القلم ہر سال ماہ رمضان اپنی خطاطی کی نمائش الحمرا آرٹس کونسل لاہور یا شاکر علی میوزیم لاہور میں باقاعدگی سے کرتے رہے۔ اسی طرح صادقین ہر سال مصورانہ خطاطی کی نمائشیں لاہور کراچی اور اسلام آباد میں کرتے رہے۔

اسلم کمال نے الحمرا آرٹس کونسل لاہور، آرٹ گیلریز لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور اور نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد کے زیر اہتمام لگاتار کئی نمائشیں کیں تو اس کے اعزاز میں نیشنل سنٹر لاہور نے ''ایک شام مصور خطاط کے نام'' کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے جناب احمد ندیم قاسمی نے فرمایا۔ ''اگر عربی کے الفاظ بول پڑیں تو وہ لفظ بولیں گے جنہیں اسلم کمال نے مصور کیا ہے''۔

اس تقریب میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سجاد، سید قاسم محمود، کشور ناہید، مستنصر حسین تارڑ، ذوالفقار احمد تابش، امجد اسلام امجد نے اسلم کمال کے فن اور شخصیت پر مضامین پڑھے۔ پروفیسر انور مسعود نے منظوم خراج پیش کیا۔

روزنامہ مشرق اکتوبر ۱۹۷۵ء ''لاہور نامہ'' میں انتظار حسین اس تقریب کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

''نئی مصوری اور خطاطی کی روایت میں اول حنیف رامے، دوم شاکر علی اور سوم اسلم کمال۔ یہ بیان ذوالفقار احمد تابش نے دیا۔ ہم یہ توقع کر رہے تھے کہ شاکر علی کے بعد ذوالفقار احمد تابش صادقین کا نام لیں گے۔ لیکن انہوں نے چشم دید شہادت پیش کی کہ حضرات میں نے خود اسلم کمال کو اس زمانے میں مصورانہ خطاطی کرتے دیکھا ہے جب ابھی صادقین کا کوئی ایسا کام سامنے نہیں آیا تھا۔

اسلم کمال کی خطاطی کی مختلف توجیحات ہوئیں۔ ہم سے پوچھو تو سب سے بڑھ کر توجیح انور سجاد نے کی۔ وہ کہتے تھے کہ اسلم کمال کی خطاطی میں لفظ آپس میں متصادم نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسلم کمال امن پسند ہے۔ جنگ کا مخالف ہے۔ اس کے یہاں لفظ ایک دوسرے سے دبتے نظر نہیں آتے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسلم کمال دبنے دبانے والے معاشرے کا باغی ہے۔

صادقین اسلامی ممالک کے لیے آیات قرآنیہ کی بہت بڑی نمائش لاہور عجائب گھر میں کچھ عرصہ سے تیار کر رہا تھا۔ اس کی تکمیل ہونے پر اس نے اسلم کمال کو بطور خاص دعوت دی اور فن پارے دکھاتے ہوئے یہ جملہ کہا ''اسلم کمال صاحب! ان خطاطیوں کی نمائش کافی عرصہ سے عجائب گھر میں لگا رکھی ہے مگر ان کو دیکھنے کوئی مصور آیا ہے نہ کوئی خطاط''۔ اسلم کمال نے ان فن پاروں کی تحسین و تعریف کی۔ صادقین نے مختلف اسلامی ممالک کا دورہ کیا اور جگہ جگہ بہت ساری نمائشیں کیں اور عالم اسلام میں اس قدیم فن کے تن میں تازہ روح پھونک دی۔ مصر کا جریدہ الاہرام لکھتا ہے ''صادقین کا فن عربی حروف ابجد میں ایک حسن نفاست شائستگی اور نزاکت کے ساتھ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جو دائروں قوسوں عمودی خطوں کے پرانے نظام کو اتھل پتھل کر کے ایک صورت گری کے ساتھ واضح ہو کر جس نے مصری فن کاروں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے''۔

۱۹۷۶ء میں وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان نے پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس کا لاہور میں اہتمام کیا۔ اس موقعہ کی مناسبت سے وزارت کی طرف ہوٹل انٹرکانٹینٹل (حالیہ پرل کانٹینٹل) لاہور میں اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کی نمائش کا

بھی انتظام کیا گیا۔ جس کو غیر ملکی اور ملکی مندوبین نے بہت سراہا اور مصری ٹیلی ویژن نے اس کی فلم بنائی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ سرکاری طور پر اتنی بڑی تقریب کے ساتھ فنون لطیفہ کی اہمیت کو منسلک کیا گیا۔

روزنامہ مشرق (۱۲فروری ۱۹۷۶ء) کی ایک خبر مندرجہ ذیل ہے:۔

''ملک کے ممتاز مصور اور خطاط اسلم کمال نے مصورانہ خطاطی میں بڑا منفرد مقام پایا ہے۔ ان کے نادر فن پاروں کو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے ایک خوبصورت کیلنڈر کی صورت میں شائع کیا ہے۔ جو بارہ صفحات کے بڑے سائز پر مشتمل ہے۔ اس کے آخری صفحہ پر مصور اور خطاط کا بڑا پورٹریٹ اور ساتھ ایک اس کی ایک انگریزی نظم دی گئی ہے۔ جس میں کائنات میں بکھرے ہوئے مہ و نجوم اسے اپنے تراشیدہ حروف ابجد کی طرح نظر آتے ہیں''۔

یہ کیلنڈر مصورانہ خطاطی کا سب سے پہلا شائع ہونے والا کسی مصور خطاط کا اعزاز تھا۔ جس کی اشاعت نے مصورانہ خطاطی کی خوبصورتی، تقدس اور رنگوں کی کثرت کی دلکشی کی وجہ سے اس کے تجارتی مصرف کی طرف ملک کے تجارتی نشر و اشاعتی اور تشہیری اداروں کو خاص طور پر متوجہ کیا۔ چنانچہ اگلے برس اسلم کمال کی مصورانہ خطاطی کا دوسرا کیلنڈر "CHAMPION PAINTS" نے شائع کیا۔

روزنامہ امروز (جولائی ۱۹۷۷ء) لاہور کی ایک خبر اس طرح تھی:۔

''پنجاب یونیورسٹی کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام نیو کیمپس کیفے ٹیریا میں اسلامی مصوری اور مصورانہ خطاطی کی کل پاکستان نمائش دو ہفتے جاری رہی۔ اس میں ملک کے ممتاز مصوروں اور خطاطوں کے علاوہ نیشنل کالج آف دی آرٹس اور شعبہ فنون لطیفہ پنجاب یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کے فن پارے رکھے گئے ہیں۔ وحید شہید ہال میں تقسیم انعامات ہوئی۔ پاکستان میں سعودی عرب کے سفیر ریاض الخطیب مہمان خصوصی تھے۔ اسلم کمال کو گولڈ میڈل صادقین کو سلور میڈل اور عثمان انصاری کو برانز میڈل دیا گیا۔ انعامات کا متفقہ فیصلہ ججوں کے ایک پینل نے کیا تھا''۔

علامہ اقبال کے صد سالہ جشن پیدائش پر ۱۹۷۷ء کو سال اقبال قرار دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں پنجاب کونسل آف دی آرٹس اور عجائب گھر لاہور نے مشترکہ طور پر علامہ اقبال کی شاعری کی مصوری اور خطاطی پر مشتمل پاکستان کے چار مصوروں (عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین، محترمہ عباسی عابدی اور اسلم کمال) کی تخلیقی کاوشوں کا گروپ شو کیا۔ مصورانہ خطاطی کے میدان میں صادقین اور اسلم کمال کے اسالیب نے تنوع آفرینی کا ایک میدان گرم کر رکھا تھا۔ اب سال اقبال میں کلام اقبال کی مصوری کے حوالے سے بھی لوگ صادقین اور اسلم کمال کا موازنہ اور مقابلہ کرنے لگے تھے۔ انتظار حسین روزنامہ مشرق (۸۔۷۔۸) میں ''باتیں اور ملاقاتیں'' میں ''اسلم کمال فن خطاطی کا صاحب کمال'' کے عنوان سے رقمطراز ہے:۔

''اسلم کمال خطاطی کے پچھلے ریکارڈ توڑنے کے درپے نظر آتے ہیں۔ مگر یہاں مقابلہ سخت ہے۔ اس میدان میں صادقین جو موجود ہیں۔ جو خود اگلے پچھلے ریکارڈ توڑنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ تعداد اور مقدار کے بھی بہت معنی ہوتے ہیں کام اگر تھوڑا ہو تو بے شک اچھا ہو۔ آسانی سے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مضامین نو کے انبار لگا دیئے جائیں تو زمانہ کیا کیا فراموش کرے گا اور کس حد تک فراموش کرے گا۔ اس کو کچھ صادقین ہی نے نہیں سمجھا ہے۔ اسلم کمال نے بھی گرہ میں باندھ لیا ہے۔ بس خطاطی میں ریس لگی ہوئی ہے۔ صادقین کا اشہب قلم ذرا بھی سست پڑا تو سمجھ لو اسلم کمال کا گھوڑا آگے جاوے ہی جاوے''۔

مصوری اور خطاطی کے نقاد اور عالم پروفیسر سجاد حیدر پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے ڈائریکٹر تحقیق و تالیف رہے ہیں۔ پاکستان ٹائمز اسلام آباد کی اشاعت ۲۲ر اپریل ۱۹۷۸ء میں لکھتے ہیں:

''اسلم کمال اپنے ۴۵ فن پارے لے کر کویت روانہ ہو رہے ہیں۔ جہاں وہ ۱۹ر اپریل کو ''ہفتہ پاکستان'' کی تقریبات میں اپنی مصورانہ خطاطی کی نمائش کریں گے۔ اسلم کمال پہلے مصور اور خطاط ہیں جن کے فن کی یہ نمائش سرکاری سطح پر پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس ملک سے باہر بھجوا رہی ہے۔ اسی سلسلے میں نیشنل گیلری اسلام آباد میں ان کے فن پاروں کی یہ حالیہ نمائش دراصل ایک پری ویو (PRE VIEW) کے طور پر ہو رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ مصور کے لیے ایک الوداعیہ ہے۔

اسلامی فن خطاطی جو بلاشبہ مسلمانوں کا عظیم ترین فن ہے۔ اس کے بارے میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ یہ فن ایک لمبے عرصے سے جمود کا شکار چلا آ رہا ہے۔ لیکن اب انتالیس سالہ اسلم کمال نے ایک لمبا فنی اور ٹیکنیکی سفر طے کر کے اس فن کو جمود سے نجات دلا دی ہے۔ کوفی اور نسخ کے امتزاج سے متکامل ہونے والا اسلم کمال کا یہ منفرد اور انتہائی دلآویز اسلوب اپنے دامن میں خطاطی کے تمام کلاسیکی محاسن اور جدید مصوری کے تمام نمائندہ رویوں کو ایک فطری اکائی میں ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ (اقتباس)

نستعلیق کے موجد امیر علی تبریزی کی طرح اسلم کمال کا یہ ذاتی اسلوب بھی ایک عمیق فنی مراقبے کا ثمرہ ہے۔ اسلم کمال کے فن پاروں میں تصویری ہیولے دعاؤں کی طرح بلند ہوتے اور بشارتوں کی طرح اترتے محسوس ہوتے ہیں''۔ (اقتباس)

کویت کے عربی اخبار روزنامہ الانباء (۷۸۔۴۔۲۵) کا کلچرل کالمسٹ لکھتا ہے۔

''خالدیہ یونیورسٹی کویت کے سائنس ہال میں پاکستان کے معروف مصور اور خطاط اسلم کمال کے فن پاروں کی نمائش اس وقت کویت شہر کی اہم ترین تقریب ہے۔ اسلم کمال کی زبان عربی نہیں ہے لیکن اس نے اپنی مصوری اور خطاطی میں عربی سے عربوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ عربی لکھنے کا یہ ایک بالکل نیا اسلوب ہے۔ جس کی دلفریبی اور دل کشی دیدنی ہے۔ مقامی صحافیوں، ادیبوں، دانشوروں، شاعروں کے ساتھ فنون لطیفہ کے شائقین اور طلبا اور طالبات نمائش میں ہر وقت اسلم کمال کے گرد گھیرا ڈالے رہتے ہیں اور مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات آرٹ پیپر اور مارکر لیے اسلم کمال کے جہازی سائز کے آٹوگراف لیتے ہیں اور اس کے نقش کی فوٹو کاپیاں نوٹس بورڈوں پر جا بجا نظر آتی ہیں۔

کائنات کے اسرار و رموز کا قفل کھولنے اور مزید معانی کی پرتیں اتارنے کے لیے اسلم کمال نے روشنی اور رنگ کے طلسم میں حروف ابجد کو عماراتی مؤلفس (گنبد و طاق و محراب و مینار) کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک مابعد الطبیعاتی تناظر مصوری میں متعارف کروایا ہے۔ اسلم کمال کی زبردست امیجری اور تخلیقی رسائی اسلامی فن مصوری و خطاطی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے''۔ (اقتباس)۔

صادقین نے کراچی لاہور، اسلام آباد، پشاور اور کوئٹہ میں مصورانہ خطاطی کا نکھار عام کیا۔ جگہ جگہ اس نے اسمائے حسنیٰ اور آیات قرآنیہ کے حروف و الفاظ کے پیچ و خم میں دلکشی اور دلربائی کے سامان پیدا کیے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخر تک اور ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دروازے تک پہنچتے ہوئے اپنی روز افزوں مقبولیت کے باوصف مصورانہ خطاطی اب ایک باقاعدہ تخلیقی تحریک بن کر سرکاری ایوانوں میں دستکیں دینے لگی۔ وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان نے پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس موقع پر پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد نے خطاطی اور مصورانہ خطاطی کے اس ملک میں اولیں گروپ شو کا انتظام کیا۔ یہ گروپ شو (اجتماعی نمائش) لیاقت میموریل لائبریری کراچی میں ہوا۔

اس میں حافظ یوسف سدیدی کے پانچ ۵ فن پارے، عبدالواحد نادرالقلم کے دس فن پارے مصور خطاطوں میں شاکر علی کا ایک فن پارہ، آذرزوبی کے پانچ فن پارے، شفیق فاروقی کے دس فن پارے اور اسلم کمال کے پچاس فن پارے رکھے گئے۔ صادقین نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس نمائش میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

روزنامہ ''ڈان'' کی جولائی ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں سید امجد علی لکھتے ہیں۔ ''لیاقت میموریل لائبریری کراچی میں پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس کے سلسلے میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس نے خطاطی اور مصوری کی نمائش کی۔ اس نمائش میں نادرالقلم اور حافظ یوسف سدیدی بھی ہیں۔ شاکر علی آذرزوبی، اسلم کمال اور شفیق فاروقی بھی ہیں ہر ایک فن کار نے اپنے فن کے کمالات دکھائے ہیں۔ قدیم اور جدید خطاطی اپنے پروقار حسن کے خزانے ہر ایک پر کھول رہی ہے لیکن جدید مصور خطاطوں میں انفرادیت، دلکشی، تنوع اور جدت کے اعتبار سے اسلم کمال اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا ہر ایک فن پارہ بہت دور سے اپنے خالق کا نام بتا دیتا ہے''۔

اس نمائش کے خاتمے پر پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے ڈائریکٹر فنون لطیفہ کے توسط سے جناب عرفان احمد ڈائریکٹر کراچی آرٹس کونسل نے اسلم کمال کے کراچی میں موجود ۴۵ فن پاروں کی کراچی آرٹس کونسل میں بھرپور نمائش کی درخواست کے ساتھ لاہور کراچی لاہور ائر ٹکٹ اور قیام وطعام کی سہولت کی پیشکش کی۔ اس زمانے میں ایک مصور خطاط کے لیے اتنے پرتپاک حسن سلوک کی یہ پہلی مثال تھی۔ اس نمائش کا افتتاح وفاقی وزیر ثقافت نے کیا۔ اہل کراچی نے مصورانہ خطاطی پر سمندر جیسے بڑے اپنے دلوں کے دروازے وا کر دیے۔

صادقین نے لاہور عجائب گھر میں اپنے زبردست اسلوب میں سورہ یٰسین ایک طویل پٹی کی صورت میں لکھ کر اسلامی گیلری کے خزانے میں نئے لعل وجواہر کا اضافہ کیا۔ اس گیلری کی کھڑکیوں کی محرابوں میں قرآن پاک کی مختصر سورتوں کی خطاطی میں آرائشی پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا چنانچہ باہر کی روشنی ان کی دلکشی کا باعث بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، ڈائریکٹر لاہور میوزیم نے صادقین کے تازہ کام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''صادقین کی عظمت اس کے مزاج کے ہر دم متغیر اور متنوع رہنے میں مضمر ہے۔ اس کی مصورانہ خطاطی میں جو ایک بجھا بجھا سا ماحول ہوتا تھا جس کی وجہ صرف ایک یا دو رنگوں پر صادقین کی قناعت تھی۔ اب صادقین نے غالباً اسلم کمال کے کینوس میں رنگوں کی کثرت کے جواب میں رنگین مارکروں کا استعمال کر کے جتنے بھی رنگ دستیاب ہو سکتے ہیں ان سے استفادہ کر کے اپنے مصورانہ وژن میں کشادگی پیدا کر لی ہے۔ جو ایک اچھا شگون ہے''۔ (روزنامہ امروز جنوری ۱۹۸۰ء)

۶/ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ریڈیو ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ضمن میں روزنامہ ڈان کی خبر یہ ہے۔ ''نیویارک ۵/ اکتوبر صدر پاکستان ضیاء الحق نے گزشتہ روز صادقین اور اسلم کمال کی کیلی گرافی کے دو فن پارے میٹروپولیٹن میوزیم آف آرٹ نیویارک کو تحفہ میں دیے اور دوسری صدی ہجری کا لکھا ہوا قرآن پاک کا نسخہ میوزیم کو بھجوانے کا وعدہ کیا''۔ (اقتباس)

مصورانہ خطاطی نے اپنے ارتقا اور مقبولیت کا ایک اور معرکہ سر کیا۔ پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے زیر اہتمام خطاطی اور مصورانہ خطاطی کا ایک روزہ کنونشن اسلام آباد میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت وزیر ثقافت نے کی۔ ملک بھر سے مصوروں اور خطاطوں نے شرکت کی۔ ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، ڈائریکٹر لاہور میوزیم، محترمہ عباسی عابدی پرنسپل نیشنل کالج آف آرٹس، محترمہ مریم حبیب اور جناب منصور قیصر ادیب وصحافی نے بطور مبصر شرکت کی۔ خطاطوں اور مصوروں میں حافظ یوسف سدیدی، اسلم کمال،

رشید بٹ، نادر القلم، ابن کلیم، شفیق فاروقی، خدا بخش اورا ے جی ثاقب، غلام سرور راہی نمایاں تھے۔ (دی مسلم ۸۰۔۱۰۔۱۵)

مصورانہ خطاطی نے اپنے آپ کو منوالیا اور پاکستان کے بصری فنون میں اسے باقاعدہ شامل کرلیا گیا۔ یعنی سرکاری سطح پر دوسرے فنون لطیفہ کے برابر کا فن اسے تسلیم کرلیا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے تحت بصری فنون کی قومی نمائش ہوئی۔ حصہ مصوری کی نمائش اسلام آباد اور حصہ خطاطی و مصورانہ خطاطی کی نمائش لاہور عجائب گھر میں ہوئی۔ بی۔اے قریشی چیئرمین لاہور میوزیم کی قیادت میں انعامات کے تعین کے لیے ڈاکٹر اکبر نقوی، جمیلہ زیدی، گل جی، قطب شیخ، عطا شاد، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار اور ڈاکٹر ایس کے بٹ پر مشتمل جج صاحبان کا پینل بنایا گیا۔ اس پینل کے فیصلے کے مطابق روزنامہ جنگ کی خبر درج ذیل ہے:

''تخلیقی خطاطی یا مصورانہ خطاطی میں اسلم کمال، سردار احمد اور زرینہ خورشید کو بالترتیب اول دوم اور سوم انعامات کا حق دار قرار دیا گیا۔ روایتی خطاطی میں سید انور حسین، نفیس رقم، قاری غلام محمد قادری مستجاب رقم اور خورشید عالم گوہر رقم کو بالترتیب اول دوم اور سوم قرار دیا گیا۔ خط نستعلیق میں حافظ یوسف سدیدی، صوفی خورشید عالم اور محمد جمیل حسن بالترتیب اول دوم اور سوم قرار پائے''۔

''روزنامہ امروز'' لاہور اور ''روزنامہ تعمیر'' راولپنڈی میں نومبر ۱۹۸۰ء میں منصور قیصر لکھتے ہیں:۔

پچھلے دنوں نیشنل کونسل آف دی آرٹس کے زیر اہتمام خطاطی کا ایک روزہ کنونشن ہوا تھا۔ جس میں مجھے بھی ایک مبصر کے طور پر شرکت کا موقع ملا۔ اس کی مفصل رپورٹ تعمیر میں آ چکی ہے۔ آج کل راولپنڈی اسلام آباد میں علمی ادبی محفلیں خوب جم رہی ہیں لیکن ان میں گرما گرم بحثیں سن سن کر کبھی کبھی کانوں میں خارش کچھ زیادہ ہی ہونے لگتی ہے۔ جس کی وجہ لب و لہجے کا منفی پن ہے۔ علم و فن اور ادب و فن میں کیا زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جذبہ انسان کا فطری جذبہ ہے جو فن کاروں میں ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک قابل تقلید مثال اس وقت خطی مصوری یا مصور خطاطی میں دیکھنے میں آ رہی ہے۔ اس تصویری خطاطی یا رنگ دار خطاطی کی ابتدا حنیف رامے نے کی یا شاکر علی نے؟ لیکن ان کا ایک لمبے عرصے سے کوئی کام دیکھنے میں نہیں آ رہا ہے۔ اس لیے اس طرز خطاطی یا اسلوب مصوری کا جھنڈا گاڑھنے والا صادقین کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ہاں البتہ صادقین کے بعد اس میدان میں دوسرا نام بلاشک وشبہ اسلم کمال ہے۔ جس محفل میں صادقین کی بات چلتی ہے تو اس کے پیچھے پیچھے اسلم کمال کا ذکر بھی ضرور آتا ہے۔ افسوس ان جوشیلے حضرات پر ہے جو اس طرح کی بحثوں میں صادقین اور اسلم کمال کو ایک دوسرے کا تخلیقی یا فنی حریف ثابت کرنے کی بجائے ان کو ازلی اور ابدی ایک دوسرے کا جانی دشمن ثابت کرنے پر اپنی ساری ذہانت خرچ کرتے ہیں۔ یہ حضرات یہ جوشیلے حضرات نہ فن کے ہمدرد نہ فن کاروں کے بہی خواہ ہیں۔ صادقین اور اسلم کمال کے ایک دوسرے سے یکسر الگ طرز مصوری و خطاطی ہی دراصل اس فن خطاطی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پس پردہ کارفرما ہیں۔ بلاشبہ یہ اسلم کمال کا کارنامہ ہے کہ اس نے صادقین جیسے مصور کی موجودگی میں اور اس کی آسمان سے باتیں کرتی شہرت اور ناموری کے دور میں اپنے آپ کو تیزی سے منوالیا ہے۔ صادقین جیسے جن کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا دم مارتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ صادقین اور اسلم کمال نے خطاطی لگ بھگ آگے پیچھے ہی شروع کی۔

بلاشبہ صادقین بہت پہلے سے ایک مانا ہوا عالمگیر شہرت کا مصور ہے۔ اور اسلم کمال ایک نوآموز ہے۔ یہ ایک اتفاق

ہے کہ دونوں نے کلام اقبال کی مصوری ایک ساتھ شروع کی اور ایک ساتھ نمائش بھی لاہور میں ہوئی۔ اب ان دونوں کی ایک ایک تصویر صدر پاکستان نے اپنے دورۂ امریکہ میں وہاں کے ایک اعلیٰ میوزیم کو تحفتاً دی ہے۔ ان اتفاقات سے ایک دوسرے کے درمیان ان میں جو دوڑ کا تاثر ملتا ہے اس کو مثبت رنگ میں دیکھنا چاہیے۔ یہ پاکستان کی مصوری کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔ جہاں تک مقام اور مرتبے کا تعلق ہے صادقین، صادقین ہے۔ ہوسکتا ہے کل کلاں اسلم کمال بھی اسلم کمال ہو جائے''۔

## ایک وضاحت

یہ مضمون پڑھتے ہوئے قارئین کے ذہنوں میں اب تک اس سوال نے یقیناً بار بار سر اٹھایا ہوگا کہ اس مضمون کے مصنف نے مضمون میں اپنا ذکر بار بار کیوں کیا ہے؟

تاریخ نویسی مشکل کام ہے۔ خاص طور پر فنون لطیفہ کی تاریخ اکثر اوقات اتنی تیزی سے کوئی موڑ مڑتی ہے اور بعض اوقات اچانک اپنا رخ کسی بالکل غیر متوقع سمت میں یوں تبدیل کر لیتی ہے کہ مورخ کی آنکھ بڑے بڑے حقائق کے خدوخال اور شکل وصورت دینے والی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو اپنی گرفت میں لینے سے محروم رہ جاتی ہے۔ وہ اس لیے کہ فنون لطیفہ کا محض ایک مورخ یعنی غیر فن کار مورخ فن کی تاریخ کا حصہ نہیں ہوتا، تاریخ کے ارتقائی سفر میں ایک مسافر نہیں ہوتا، تاریخ کے دھارے میں خود نہیں بہا ہوتا اور فن کی بنتی ہوئی تاریخ میں بطور فنکار کے شامل اور شریک نہیں رہا ہوتا۔ چنانچہ ارتقائی مدارج اور مراحل میں فن اور فنکار کے تخلیقی پیچ وتاب کی تفصیلات تک اس کی رسائی نہیں ہو پاتی۔

مصورانہ خطاطی کو اپنا ایک باب یا زیادہ سے زیادہ ایک گوشہ بنانے والی جن تواریخ کا ذکر پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ یہ مضمون لکھنے کی ضرورت ان کا ادھورا پن یا نامکمل ہونا نہیں ہے۔ لیکن اس مشکل کا اعتراف ناگزیر ہے کہ تاریخ کبھی رکتی نہیں ہے۔ اس مضمون کے مصنف اور مصورانہ خطاطی کے دوسرے مورخین میں فرق واضح ہے کہ مورخین نے مصورانہ خطاطی کے حالات و واقعات سن کر یا پڑھ کر لکھے ہیں۔ جبکہ اس مضمون کا مصنف ایک مصور اور خطاط ہونے کے ناطے مختلف ادوار کے حالات و واقعات میں اس صنف نو کے رد وقبول کے حوالے سے متداول جو رویے تھے وہ ان کے متقابل آتا یا ان سے متصادم ہوتا یا ان سے متاثر ہوتا اور یا ان کو متاثر کرتا ہو یعنی ان کے اندر سے گزر کر آیا ہے۔ وہ اس مصورانہ خطاطی کے ساتھ اس کی ابتدا سے تادم تحریر ایک مصور اور خطاط کے طور پر جڑا ہوا آ رہا ہے۔ یہ تاریخ اس کا ایک تجربہ بھی ہے۔ چنانچہ اس کے پاس جو چشم دید واقعات اور ان کا تناظر ہے، جو مشاہدات اور ان کے نتائج ہیں اور جو معلومات ہیں اور ان کے ماخذ ہیں۔ محض مورخین کے پاس ہیں نہ ہو سکتے ہیں اور نہ ان سے توقع ہی کی جا سکتی ہے۔

# بشیر موجد کی مصورانہ خطاطی کا پس منظر

ڈاکٹر آغا سہیل

اکیسویں صدی کے اوائل میں نباتات اور حیوانات کی کلوننگ نے خلیوں (Cells) کی پوشیدہ اور خفیہ خزانوں کے راز منکشف کر دیے ہیں۔ ممکن ہے انسان کی متخیلہ اور اس کے مافی الضمیر کے بتدریج ارتقاء کی فطری اور قدرتی جدول بھی ظاہر ہو جائے جس سے ارادے پر کسی غیر معمولی قوت کی اجارہ داری ثابت ہو جائے کہ ترسیل خیال اور ابلاغ کی خواہش اور جبلت گویائی کے علاوہ تحریر میں اپنا اظہار کیوں چاہتی ہے۔ ظاہر ہے تحریر بعد زمانی اور مکانی کے فاصلوں کو مرحلہ وار طے کر کے مستقبل تک بھی پہنچتی ہے اور مستقبل کی نسلوں سے مکالمہ کرتی اور رازہائے سربستہ کھولتی ہے۔ تحریر ہی وہ کیفیت ہے جو بُعد زمانی و مکانی کو طے کر کے صرف ماضی اور حال کی تاریخ کو منکشف نہیں کرتی بلکہ انسان کے دل اور دماغ کے پوشیدہ خزانوں کو ظاہر کر کے نوع بشر کو پر ثروت بناتی ہے۔ چنانچہ ماضی بعید کے محیر العقول مآخذ کے گم شدہ اوراق کی جستجو اور کھوج کا سلسلہ ہنوز جاری ہے تا کہ ماضی کے انسانوں کی تاریخ، ان کی معاشرت اور تہذیب اور انسان (ماضی) کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چل سکے۔ اس کا انتہائی منضبط راز ان کی تحریروں سے ظاہر ہو سکتا ہے جو موثق اور مستند ہوگا، یہی وجہ ہے کہ آثار قدیمہ یعنی Archeological Scripts میں انسانوں کی تحریر کردہ تسوید یا مسودات پر توجہ سب سے زیادہ دی جا رہی ہے۔ ان تحریروں سے علوم پارینہ ہی کا انکشاف نہیں ہوتا بلکہ تحاریر کی جو شکلیں سامنے آ رہی ہیں ان سے ابتدائی بولیوں (Dialects) کی صورت حال پر بھی روشنی پڑ رہی ہے اور ان بولیوں نے بتدریج جب زبانوں کا روپ دھارا اور اپنی فطری نشو ونما سے تحریر کے درجہ کمال تک پہنچیں تو صدیوں اور قرنوں کا زمانی فاصلہ کس کس طرح طے ہوا، بعض ماہرین علوم السنہ نے صوتیات کے علامات اور ان کے مخارج پر روشنی بھی ڈالی ہے اور جدولوں سے مصوتوں اور معصوں کو سمجھانے کی سعی کی ہے۔ یعنی Phonetics & Phonemics کے عمیق مطالعے سے بولیوں سے زبانوں تک کے سفر کو مرحلہ وار سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

یونان، قدیم ہند اور مشرق وسطیٰ کے آثار جو دریافت ہوئے ہیں ان میں ماہرین نے دلچسپی لے کر جو جدولیں مرتب کی ہیں ان میں معرب اور مفرس حروف کی ایک جمالیاتی تاریخ موجود ہے۔ یعنی حروف تہجی کی شکلوں نے افہام تفہیم کے لیے آسانیاں فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ دلکشی خوبصورتی اور جاذبیت کے لیے کیا کیا صورتیں اختیار کیں۔ اس سلسلے کی ایک مبسوط تاریخ ہے اور خطاطین کا ایک وقیع ورثہ ہے جو سہل الحصول ہے۔ مگر چونکہ یکجا نہیں ہے بلکہ منتشر ہے اور مختلف النوع مآخذ میں حروف تہجی کے اشکال کے تغیر سے جو جدولیں مرتب ہوئی ہیں وہ ادوار کے مزاج اور مذاق کو ظاہر کرتے ہیں۔ لہٰذا موجودہ زمانے تک پہنچتے پہنچتے ان کی ترقی یافتہ شکل نقطہ عروج پر ٹھہر چکی ہے یعنی مکمل ہو چکی ہے۔ اب محض ان اشکال کے دائروں، قوسوں اور نقاط کی تزئین و

آرائش میں احساس جمال کی توانائی سے متناسب اضافہ ہوتو ہو باقی کی گنجائش نہیں ہے۔

نیز علم السنہ کی رو سے حروف تہجی کے اشکال بجائے خود اصوات کی علامتیں ہیں جو مخارج کی صحت سے متعین ہوتی ہیں بالخصوص عربی زبان کی قرات اور ان کے مخارج اور نزاکت اور لطافت پر توجہ رکھنا پڑی ہے کہ قریبی اصوات کے حروف سے لفظیات مسخ ہوکر معانی اور مفاہیم سے مغالطہ پیدا کر کے عبارت میں خلط مبحث کا موجب بن جاتے ہیں۔ علم لسانیات میں اس علم کو Morphology Sementics کے حوالے سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

عربی زبان میں چونکہ صحائف کا نزول اجلال ہوتا رہا اس لیے مسلمانوں کے عقائد و مسلمات کا وہ مآخذ اور سرچشمہ ہے لہذا اہل اسلام بر بنائے ارادت وعقیدت ام الکتاب سے رجوع رہے اور خطاطین آیات قرآنی کی فضیلت کو اپنی خوش نویسی کو باعث برکت اور توشہ آخرت سمجھ کر اپنے متاع ہنر سے سنوارتے اور سجاتے رہے۔ گھروں کی تزئین و آرائش کے لیے طغرے، اشعار اور سجے معروف اور مستند خطاطوں کے ہنر کی داد و تحسین کے مستحق قرار پاتے رہے اور یہی ان کے فن کی نمود و نمائش کے مراکز تھے۔ نکتہ فہم یہاں جمع ہوتے اور خطاطوں کے فن کی دقت نظر سے تفہیم کا ذوق سلیم رکھتے تھے، حروف کے دائروں قوسوں اور نقاط کی نشت اور نہادگی کے فن اور اس کی تراش خراش سے موبہ موآگاہی رکھتے اور معروضی تجزیہ کر کر کے سند فضیلت دیتے۔ اور کسی ایک خطاط کو دوسرے سے بالموازنہ فائق محض فنی نکات کی بناء پر قرار دیا جاتا۔ اگر یہ باریک بینی اور دقت نظر پرکھنے والوں میں نہ ہوتی تو آج ہمارے خطاطین کے امتیازی اوصاف پردۂ خفا میں مستقر رہوتے۔ رہا مذکورہ خطاطین کے افکار کے مراکز اور ارتکاز توجہ کے محور کا مسئلہ تو مسلم اشرافیہ اطراف واکناف عالم میں دانشوری کے دبستان تشکیل دیتی رہی جس کی متخیلہ کی فضا اور ماحول کے جملہ ارض وسماں اسلام کی مابعد الطبیعیات سے قائم رہتے۔ لہٰذا ام الکتاب (قرآن) کے آیات کو خطاط خود سے (انسان) سے ہم کلام سمجھتا۔ قُل سیر فی الارض کو سرچشمہ ہدایت ہمارے فن کاروں نے قرار دیا اور خود کو خلیفۃ الارض اور وارث اور مخاطب سمجھا۔ جس سے بشمول خطاطی جملہ دانش جو متاثر ہوتے تھے، برصغیر میں تاریخ کے ہر دور میں ایسے مراکز قائم ہوتے رہے اور فکری دبستان بنتے رہے جن کے اذہان کا افق اسلامی مابعد الطبیعیات تھا۔ اختر حسین رائے پوری جب وشال بھارت کی تحریک کے سلسلے میں سارے برصغیر کا سفر کر رہے تھے تو انہوں نے دہلی لاہور اور علی گڑھ کے اسفار دورانیہ میں (اپنے خودنوشت، گرد سفر میں اعتراف کیا ہے) ان خطہ ہائے ارض پر اسلامی مابعد الطبیعیات کا اس قدر گہرا اثر دیکھا کہ وشال بھارت کی یہاں پذیرائی ممکن نہیں ہے، یہ اعتراف بجائے خود ایک اقرار بھی ہے کہ یہاں کے دانش وروں اور دانش جو اپنے عقائد و نظریات میں راسخ ہیں۔ چنانچہ یہاں کے شعراء، انشاء پرداز اور مصور اور خطاطین کا اوڑھنا بچھونا اسلام ہے۔ یہاں کا مسلمان اسی بساط پر آنکھ کھولتا ہے اور اسی پر آنکھ بند کرتا ہے۔

جنوبی بھارت میں جو مسلم ریاستیں بنتی رہیں اور شمالی بھارت تک جن کے فکری دبستان بنتے رہے ان میں جملہ فنون لطیفہ بشمول خطاطین اپنی ایک منضبط اور مستند تاریخ کے حامل رہے ہیں۔ مسلم سلاطین نے بطور خاص ان فن کاروں کی پذیرائی کی۔ مغلوں کے تمدن اور تہذیب کا دورانیہ بھی وسیع تھا اور برصغیر سے لے کر مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید تک مسلمان پھیلتے جا رہے تھے اور ان کی صنعت وحرفت کا دائرہ روز بروز ارتقاء پذیر تھا، دوسری طرف عرب، ایران، مصر اور قرب وجوار کے مسلمانوں کا اور دور دراز کی بستیوں کے مسلمانوں کا مرکز اور محور خانہ کعبہ بنا جو مسجود اور محور کی حیثیت رکھتا تھا، نزول قرآن بجائے خود ایک غیر معمولی

واقعہ تھا۔ جس سے معلقہ کے مسلم الثبوت شاعر اور دانش ور متاثر ہوئے اور اس کے جواب الجواب شعرا نے اپنی انسانی قوت کی شکست قبول کر کے اللہ تعالیٰ کی جلالت قدر کے پیڈسٹل کی رفعت اور بلندی کو مان لیا اور سورہ رحمٰن کے نزول نے ساری دنیا کے خطاطین کو جنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جہاں جہاں مسلم ریاستیں قائم تھیں خطاطین وہاں وہاں اپنی دانش گاہوں میں اپنے اپنے مکاتب فکر کی کاوشیں اور ہنر مندیاں آزما رہے تھے۔

برصغیر میں دہلی، لاہور، لکھنو اور حیدر آباد میں خطاطین کے اسکول قائم تھے اور مشرق و مغرب کے مصوروں اور خطاطوں کے شاہکار شب و روز معرض وجود اور معرض شہود پر آ رہے تھے۔ متذکرہ بالا مقامات کے مکاتب کے متنوع مصور اور خطاط اپنے ماحول اور فضا کے تقاضوں کے اثرات بھی قبول کر رہے تھے اور اپنی اپنی انفرادی مخیلہ کی کرشمہ سازیوں سے کام لے کر اپنا مقام خود بھی دریافت کر رہے تھے۔ مصور کا مو قلم اور خطاط اپنے صریر خامہ کو نوائے سروش کو سب سے الگ سمجھتا تھا لیکن خط کوفی، خط نسخ اور خط نستعلیق کے حدود و قیود کے احاطے کے باہر قدم رکھنے کو جملہ خطاط بدعت اور سوء ادب سمجھتے تھے۔ انہیں دوائر میں رہ کر اپنی کاوشوں کی ہنر مندیوں میں متنوع تجربات کرتے رہتے تھے۔ لاہور اور دہلی کے مکتبہ فکر پر مصور عبدالرحمٰن اور دیگر خطاطین کی حکمرانی قائم تھی جو مغل معاشرت اور تہذیب کے صحیح ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے زیر اثر ایرانی (نستعلیق) خط کی جاذبیت موزوں تناسب اور آرائش نے مقبولیت خاص حاصل کی اور ان کے خوشہ چینوں اور شاگردوں کا ایک ایسا جم غفیر پیدا ہوا جو بیسویں صدی سے لے کر اکیسویں صدی تک محض پنجاب کے احاطے تک محدود نہیں رہا بلکہ برصغیر کے گوشے گوشے میں پھیل گیا اور عہد مغلیہ سے لے کر برٹش انڈیا جس کے خوشہ چینوں اور شاگردوں کے شاہکار کے انبار قدر دانوں سے اپنا لوہا منوا رہے ہیں ان مصوروں اور خطاطوں کو اب کسی ایک شہر سے نسبت نہیں رہی اور محض شہروں کے محل وقوع کے حصار میں ان کے فن کو قید نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کے اذہان کے افق بے حد وسیع کشادہ اور نہادگی میں بسیط و عریض ہیں جن کا کوئی اور چھور نہیں ہے۔ مشرق اور مغرب میں یہ فن کار معتکف ہیں۔ یہ خود کسی ایک مقام سے نسبت نہیں رکھتے بلکہ ان کا خود ایک مقام متعین ہو چکا ہے البتہ ان کے فن کی تخصیص میں پہچان اور شناخت کے لیے عرب ایران لبنان مصر اور ہندوستان اور پاکستان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ پاکستان (لاہور، کراچی، اسلام آباد) کے مصوروں اور خطاطوں نے اپنا خود ایک انفرادی تشخص پیدا کر لیا ہے۔ پہلے بھی مصوروں اور خطاطین کی فن کاری کے شاہکار محض کاغذ تک محدود نہیں تھے بلکہ تاریخی عمارات، معابد، مقابر، قلعوں، محلات، میناروں کے کتبوں زیبائش و آرائش کے نقش و نگار لکڑی اور پتھروں میں کندہ کاری اور منبت کاری کے فن سے اپنے فن کار کا کلمہ پڑھتے کہ وہ جاگیرداری کے نہب اور دبدبے کی فضا تھی اور پھر جب عہد انگلشیہ میں زرعی معاشرہ صنعتی معاشرے میں تبدیل اور اجتماعی زندگی کی رفتار سرعت رفتار بنی تو متحرک فلموں، کتابوں، مجلوں کی اور اخباروں کی کثرت نے ایک نئی صفت کا دروازہ کھولا تو مصوری اور خطاطی کے فن کو نہ صرف تقویت ملی بلکہ ان کا ریج اور کشادہ ہو گیا۔ ٹیلی وژن نے ہر زاویے سے مصوروں اور خطاطوں کی پذیرائی کی اور ان کے فن کی نمو اور نمائش پر وسعت اور پنہائی۔ چنانچہ مصوری اور خطاطی میں دو اسکول بہت واضح طور پر سامنے آئے۔ ایک کو کلاسیک کا درجہ ملا اور دوسرے کو جدید، اس میں بُعد زمانی اور مکان تو ہے مگر مشرق اور مغرب کے آرٹ کا فرق بھی موجود ہے۔ مغرب میں لندن کے آرٹ گیلریاں اور فرانس کے شاہکاروں کی تو گنجائش ہے مگر مشرق کو ان میوزیموں میں جگہ ملتی ہے۔ جس سے مشرق کی تہذیب اور تمدن کا تحفظ ہوتا ہے مگر خطاطی کو وہاں خاطر خواہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خطاطی کا مغرب میں چلن، ممکن (بوجوہ) نہیں ہے۔

عربی فارسی اور دوسرے مشرقی زبانوں کے خطوط اور ان کے حروف دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی طرف اپنا رخ رکھتے ہیں جبکہ مغربی زبانوں کے حروف تہجی ((جو تعداد میں مشرقی زبانوں کے حروف سے کم ہیں) بائیں سے دائیں رخ پر چلتے ہیں۔ نیز مذکورہ مغربی حروف کے دائرے اور زاویے بھی محدود ہیں۔ مشرق میں سوائے دیوناگری رسم الخط کے بائیں سے دائیں چلنے والے حروف نہیں ہیں، نیز علم السنہ کے ماہرین جانتے ہیں کہ عربی اور فارسی حروف کی آوازوں کے مقابلے میں دیوناگری رسم الخط کی آوازیں کم ہیں ناقص ہیں اور اکثر مہمل اور اپنے حصر کی کوتاہی سے معانی اور مفاہیم کو خبط یا گم کر دیتی ہیں اور جگہ بھی زیادہ گھیرتی ہیں۔ خطاط اسی بنا پر دیوناگری رسم الخط سے رجوع نہیں ہوئے۔ عربی فارسی اور اردو زبانوں کے حروف تہجی اپنی خوبصورت قوسوں، دائروں اور نقطوں کے تعین سے پرکشش نظر آتے ہیں۔ خط جلی اور خط خفی کی متناسب اور متنوع نہادگی حسن کا اضافی وصف ہے۔ یوں تو خطاطین کی ایک دلکش کہکشاں برصغیر اور مشرق تک جلوہ گری کر رہی ہے لیکن فی الحال لاہور (کہ پنجاب عروس البلاد ہے) دامن دل کو کھینچ رہا ہے کہ پاکستان کی ثقافت اور تہذیب کا نمائندہ بھی ہے اور ماضی قریب کے خطاطین سے مملو نظر آتا ہے۔ یہاں ان گنت مانی و بہزاد نہ سہی مانی و بہزاد کے مثنیٰ معرض شہود پر نمودار ہو رہے ہیں۔

لاہور میں فنون لطیفہ میں مصوروں اور خطاطین کی جو ایک توانا روایت کا تواتر اور تسلسل سے سلسلہ قائم ہے اس کے تاریخی ثقافتی اور تہذیبی اسباب ہیں۔ دور مغلیہ کے باقیات الصالحات ورثے میں تاریخی عمارات کی دلکشی اور جاذبیت میں آرنیمنٹل تنوع اور ان کی تزئین و آرائش میں مصوروں اور خطاطین کے کمالات محفوظ اور مستور ہیں۔ ایران میں اصفہان کو جو نصف جہان کا درجہ حاصل تھا اس میں عمارت سازی اور ظروف سازی کی نقش نگاری کا مقام نمایاں تھا۔ مغلوں کی تہذیب میں برصغیر میں جو یہ ورثہ جنوبی ہند اور شمالی ہند میں منتقل ہوا اس کا بڑا حصہ دہلی، آگرہ اور لاہور کے حصے میں آیا۔ چنانچہ علم و ادب کے شاہکاروں سے لے کر فنون لطیفہ کے کمالات تک کا سرمایہ بھی وراثتاً لاہور کو منتقل ہوا۔ اقبال کو ایرانیوں نے اقبال لاہوری کہا تو منجملہ ان کے شاعرانہ کمالات دیگر اوصاف حمیدہ کے مصور عبدالرحمٰن کے حوالے سے بھی کہا جنہوں نے شعر اقبال کو منور اور مستند کیا تو اس میں جو نقش و نگار کی وضع قطع کی جھلک نظر آئی اس سے لاہور کا تشخص ایرانی فنون لطیفہ کی تہذیب میں نمایاں تھا۔

## ﴿۲﴾

بشیر موجد کا ذہنی افق بھی لاہور کی تہذیبی زندگی میں نشوونما حاصل کرتا ہے، ابتدائی تعلیمات کے حصول کے دورانیہ ہی میں مصوری اور خطاطی سے شغف پیدا ہوا۔ لاہور کے اساتذہ کے فن سے شعوری اور غیر شعوری طور پر بالواسطہ اور بلاواسطہ موجد متاثر تھے (۱۵/اگست ۱۹۳۵ء) سے لے کر ۵۲م اور ۶۲م تک کا دورانیہ بشیر موجد کی ذہنی تربیت تہذیب ہے۔ رنگ و نیرنگ (ان کے فنی ارتقاء کے متنوع زاویوں پر روشنی ڈالنے والا ان کی کاوشوں کا بہترین نمونہ ہے۔ خطاطی اور خطاطین کی جس سے ایک مستند تاریخ بھی مرتب ہوتی ہے اور خود بشیر موجد کی انفرادی شخصیت کے بتدریج ارتقاء پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ اس موقع پر ماہرین السنہ کسی زبان کی تحریری شکل کی تشکیل کو معاشرتی وظائف کے تقاضوں سے وابستہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ حروف تہجی کی اساس صوتیات کی علامات پر مبنی ہوتی ہے۔ خط کوفی (محض شہر کوفہ سے نسبت نہیں رکھتا بلکہ ماہر السنہ اس کی نسبت حضرت علیؓ جو کثیر اللسان

شخصیت کے حامل تھے قائم کرتے ہیں) خیال کیا جاتا ہے کہ شروع شروع میں صوتیات کی علامتوں کو سیدھی سادی لکیروں اور خطوط پر استوار کیا گیا اور ان اشکال کی تفہیم کے لیے گردوپیش کے ماحول کی اشیاء کو ملحوظ رکھا گیا جس میں حسن و جمال سے زیادہ ترسیل خیال پر توجہ مرکوز ہے۔ لیکن خط کوفی سے نسخ کی طرف ارتقا کا تدریجی سفر جاری رہا جو امتداد زمانہ میں معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں کو پورا کرتا رہا۔ نستعلیق عجمی (ایرانی) روابط قائم ہونے پر اچانک نمودار نہیں ہوا بلکہ اس کے تدریجی ارتقا کا دورانیہ صدیوں پر محیط ہے۔ خطاطین کی تاریخ کے اس دور کو ملحوظ رکھا جائے تو تاریخ میں مادی جدلیاتی نظریے میں جنگ اور امن، قبائل اور متصادم معاشرتوں کے تجارتی ثقافتی روابط کے ہمہ گیر اور ہمہ جہت محرکات اور عوامل کی جزئیات کا تجزیہ کیجئے تو بہت سے حقائق سامنے آتے ہیں اور قوموں کے ارتباط کے مختلف النوع شعبے قائم ہوتے جاتے ہیں یعنی کسی شے کی ساخت اور بناوٹ کی تکمیل کے بعد اس میں تزئین و آرائش اور جذب و کشش پر توجہ دی جاتی ہے۔ خط کوفی سے خط نسخ اور وہاں سے نستعلیق کی جانب سفر کا مرحلہ آتا ہے۔ اسی مرحلے پر خطاطین اپنی اجتماعی اور انفرادی کاوشوں سے کاغذ پر متشکل کر کے عمارتوں پر اور ظروف پر منتقل کر کے ایک ایک یادگار بناتے ہیں۔ بشیر موجد نے اسی مرحلہ پر لاہور میں جب ہوش سنبھالا تو اس فن کے نامی گرامی اساتذہ بھی موجود تھے۔ ان کی ایک مربوط تاریخ بھی ان کے سامنے تھی اور ان کی کاوشوں کی تہذیب متحرک اور فعال صورت میں سانس لے رہی تھی جس میں بشیر موجد کے معاصرین اور اساتذہ عبادت کی طرح اپنے ریاض میں منہمک تھے۔ موجد کا بیان ہے کہ تعلیم کے ابتدائی مراحل ہی میں حروف کے خطوط اور فضا اور ماحول کے نت نئے رنگ ان سے چپکے چپکے سرگوشیاں کرتے تھے اور تقاضہ کرتے تھے کہ بار و گرد دیکھو غور کرو اور ان میں معانی اور مفاہیم دریافت کرو، وہ جو افلاطون نے کسی مثالی دنیا کی خبر دی تھی وہ اس کی شخصیت کے باہر نہیں بلکہ اس کے درون میں واقع تھی اور اس کے شاگرد ارسطو نے اس کی تردید کی تھی تو دراصل اسے خود مغالطہ ہوا تھا۔ افلاطون کے درون تخلیق کی طرح اس کی قوت متخیلہ یعنی Power of Imagination کی موجودگی کا احساس تھا، اسی متخیلہ کی توانائی موجد کو بار بار متوجہ کرتی تھی، جب انیا مولیکا احمد سے ایک بار میں نے صادقین کے فن کے بارے میں استفسار کیا اور موصوفہ نے صریحاً صادقین کو مصور کے بجائے خطاط تسلیم کیا اور مصور ماننے سے منکر ہوئیں تو معاً میرے ذہن میں پال کلی کا خیال آیا تاہم میں عمداً طرح دے گیا کہ انیا مولیکا احمد سوالات پر منفض نظر آ رہی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ صادقین نے ایک بار اثنائے گفتگو میں محبت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر سوال کیا تھا۔ آپ نے صرف میرا ہاتھ نیچے کو پھیلا کر انگشت شہادت کو الف اور ساتھ کی انگلیوں کو ملا کر دکھایا اور کہا یہ اللہ ہے ظاہر ہے ایک تخلیق کار مصور اور خطاط کی متخیلہ موجودات کے بارے میں اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ بشیر موجد پر یہی واردات گزرتی رہی تھی۔ ان کو ادراک تھا مگر گردوپیش کے ماحول کے افراد موجد کے عہد طفولیت کے اس ذہنی لطیفے سے بے خبر تھے۔ موجد کے گردوپیش کا ماحول بھی تخلیق کاروں اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں سے چھلک رہا تھا، معاصرین، اساتذہ ہر طرف شعراء و انشاء پرداز ہی نہیں مصور اور خطاطوں کی تخلیقات کے انبار لگے ہوئے تھے۔ موجد کے ہاتھ میں برش بھی تھا اور قلم بھی، متخیلہ میں نمو پذیر توانائی بھی تھی اور نوائے سروش کی صدائے بازگشت بھی۔ چنانچہ برش اور خامہ حرکت میں آ گئے، اسی حرکت میں جو برکت تھی کہ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے استادوں اور معاصر احباب سے رجوع ہونے لگے۔ واضح رہے کہ جوینده یا بندہ کے مصداق بشیر موجد نے مقامی اور غیر مقامی میں اپنے فن کے ارتقاء لیے حصر یا موانع پیدا نہیں کیے، بلکہ خط کوفی سے لے کر خط نسخ اور نسخ میں لے کر نستعلیق کے ارتقاء میں جو بھی انہیں اپنے فن کے ارتقاء میں معین و مددگار نظر آیا اس سے رہنمائی حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ارتکاز توجہ فن کی صحت اور نستعلیق میں حسن و زیبائش پر رہی۔ یعنی وہ کسی استاد سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ

اس کے فن سے متاثر ہو کر اپنا راستہ خود متعین کرتے رہے۔ یہی ذوق سلیم اور فن کی سچی لگن ہے جس میں اساتذائے فن بھی آتے ہیں اور معاصرین بھی مصور بھی آتے ہیں اور جو بھی بقدر ضرورت نظریہ ضرورت کے تحت سب سے استفادہ کیا کہ ہر دانش جو تعمیر فکر کی جستجو میں اسی طرح سرگرم عمل رہتا ہے، اس میں لینڈ اسکیپ ہو، وش ورک، سپرے ورک یا اورینٹیل نقاشی (جس میں منبت کاری بھی شامل ہے۔) بقول شخصے نقاشی ایک ایسا فن ہے جس سے زمانی و مکانی لحاظ سے عروج و زوال کے بہت سے ادوار ہیں تاہم فی زمانہ زوال پذیر ہے۔ موجد نے اس فن کے شد و مد کو نگاہ میں رکھ کر دور حاضر کے فنی تقاضوں سے جو اجتہاد کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ فن نقاشی جو بجائے خود ہمہ جہات، ہمہ گیر اور ہمہ رخ گمبھیر تھا اس میں ترمیم و تنسیخ کر کے اپنے فن کے لیے گنجائش نکالنا اجتہاد تھا۔ مگر چونکہ تخلیقی ذہن نمو پذیر رہتا ہے اس لیے وہ متقدمین اور معاصرین دونوں سے استفادہ بھی کرتا ہے اور ان کی خامیوں پر نظر رکھتے ہوئے اپنے فن کی تکمیل کرتا ہے۔ موجد نے یہی کیا اور اس میں اپنا ایک منفرد اور متنوع مقام خود دریافت کیا جو ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ چنانچہ انہیں Versatile Genious قرار دیا گیا۔ اصل میں تخلیقی ذہن کے سامنے بقدر یک نقطہ بھی نقش مہیا ہو اور اسے اس میں نمو پذیری کی گنجائش ہو تو وہ اس ایک نقطے میں خطوط اور رنگوں سے ایک پُر معنی گلزار بنا سکتا ہے۔ موجد نے اس فن میں داد و بیداد سے بے نیاز ہو کر تخلیقی قوتوں سے سرشار ہو کر جو ریاض کیا تو اپنے لیے بھی ایک منفرد مقام بنایا اور اس فن کو بھی ایک مقام عطا کیا۔ (ملحوظ رہے کہ اس کی کچھ تصاویری دستاویزی ثبوت کے طور پر محفوظ ہیں)

برصغیر میں امام ویردی نستعلیق (خط نستعلیق) مسلم الثبوت ماہر ہو۔ ازاں بعد عبدالمجید پروین رقم ہیں جنہوں نے تخلیقی اپج سے کام لے کر خط نستعلیق کو ایرانی اثرات سے آزاد کیا اور قوموں کے منہاج کو زیادہ جاذب توجہ بنایا۔ اسی کو تخلیقی اپج کہتے ہیں۔ جو زمانی و مکانی لحاظ سے اپنے تقاضے متعین کرتے ہیں۔ پروین رقم نے دائروں اور قوسوں میں نئی تراش خراش کی۔ چنانچہ دور حاضر کے خطاط آج تک اسی روش پر چل رہے ہیں جس طرح حامد الدین نے خط ثلث قدیم کو خط جدید ثلث میں بدلا جس کی آج تک پیروی ہو رہی ہے۔ عبدالمجید پروین رقم، پروینی بیضوی تراش خراش کا استاد تھا۔ حامد ترکیہ خط ثلث کا مسلم الثبوت استاد مانا گیا۔ ان اساتذۂ فن کے علاوہ بشیر موجد نے اپنے معاصرین اور ماہرین سے بھی اپنے فن خطاطی اور مصوری دونوں کو تقویت پہنچائی کہ موجد کو مصوری سے جو شغف تھا اس نے ان کی خطاطی کو اور خطاطی نے مصوری کو متاثر کیا۔ چنانچہ معاصرین میں حنیف رامے اور اسلم کمال اور استادوں میں گل جی قابل ذکر ہیں۔

شعوری اور لاشعوری طور پر تخلیق کا روقتاً فوقتاً تخمیر کلر کرتا رہتا ہے اور انہیں متخیلہ کو پُر ثروت بناتا رہتا ہے۔ اگر بشیر موجد کی رنگ نیرنگ (بروشر) کا بالاستعیاب مطالعہ کیا جائے تو خطاطی اور مصوری دونوں کے پہلو بہ پہلو بتدریج ارتقاء کا ایک قابل لحاظ گراف سامنے آتا ہے جو ارتقا پذیر ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن خطاطی اور مصوری کے فنون بھی ترقی کر رہے ہیں اور بشیر موجد کی قوت نمو بھی آگے اور آگے بڑھ رہی ہے، اس ضمن میں ان کے بروشر (رنگ نیرنگ کے درج ذیل نمونوں پر توجہ کی جا سکتی ہے۔)

انیسویں صدی میں زرعی معیشت جب صنعتی معیشت میں بدلی تو ترقی کا ایک نیا باب کھلا۔ یورپ میں مصوری اور مشرق میں خطاطی اور مصوری دونوں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن جب جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی کی نیوکلیر قوت کا اظہار در پیش ہوا تو بشمول بشیر موجد ساری دنیا کے فن کار دہل کر رہ گئے اور اس فن میں ایک ہولناک ارتعاش پیدا ہوا، آگے کیا ہوگا یہ مسئلہ دیدہ وروں کے لیے غور طلب ہے۔

# مرقع چغتائی

## غالب کے مصور نسخہ کی داستان تخلیق

محمد عبدالرحمٰن چغتائی

غالب کے مصور ایڈیشن ۔ مرقع چغتائی ..... کی تخلیق کے سلسلے میں اس سے قبل بھی کچھ گزارشات پیش کر چکا ہوں اور اس موقع پر بھی چند نئے اضافوں اور وضاحتوں کے بعد یہی داستان دہراتا ہوں۔ اس عظیم اور فنی پیش کش کی اہمیت پر اس بیان سے بھی کافی روشنی پڑے گی۔

میری زندگی اور میرے فن کی داستان میں ۱۹۱۹ء بہت اہم سال ہے۔ یہ سال وہ ہے جب میرے فن کی ابتدا ہوئی۔ یہی زمانہ ہے جب مجھے اپنے مستقبل سے روشناس ہونے کا موقع ملا اور یہ احساس زندگی کا جزو بن گیا۔ احساس یہ تھا کہ مجھے آئندہ ایک بڑا فنکار بننا ہے اور اسی کے لیے جینا ہے۔ یہ خودی کی بیداری تھی۔ اس سے قبل میں کچھ افسانے اور کہانیاں بھی لکھتا تھا اور اب بھی لکھتا ہوں، لیکن یہ محض ایک شوقیہ مشغلہ تھا اور ہے۔

۱۹۲۴ء میرے امتحان اور خود اعتمادی کی آزمائش کا سال تھا اور اس کے اظہار کا موقع بھی پیدا ہوا۔ میں ان دنوں میو اسکول آف آرٹ لاہور میں ایک انچارج کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس عہدہ سے جب گلوخلاصی کی نوبت آئی تو اس وقت میں رخصت پر تھا۔ چھٹیاں گزار کر جب ادارے میں واپس آیا تو کالج کے پرنسپل سے آمنا سامنا ہوا۔ یہ ایک انگریز افسر تھا۔ فنکار اور منتظم بھی بہت اچھا تھا۔ اس نے مجھ پر ظاہر کیا کہ چھٹیوں کے دوران میں سینما دیکھتا رہا ہوں!۔ یہ ایک چغل خور کی حرکت تھی۔ چغل خور کون تھا، میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ شخص میری فنی کامیابی اور ہر دلعزیزی کو دیکھ دیکھ کر جلتا تھا اور میرے پیچھے پڑا ہوا تھا اور ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ میرے خلاف کان بھر سکے۔ بلکہ مجھے نقصان پہنچنے کا امکان بھی پیدا ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ میری بنائی ہوئی تصاویر کی نمائش ہو رہی تھی۔ ''پنجاب فائن آرٹ سوسائٹی'' کی پہلی نمائش ہوئی تو اس میں کام کی غیر معمولی قدر کی گئی۔ کئی تصاویر کم وبیش چھ سات ہزار میں فروخت بھی ہوئیں۔ ان کا بیشتر حصہ ہز ہائینس میر صادق عباسی بہاول پور نے خرید فرمایا تھا۔ یہ پہلا فاتحانہ معرکہ تھا۔ جس وجہ سے قدرتاً حاسدوں کا بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ میں نے موقع پر اپنے آپ کو ایسے حاسدوں کے بیچ میں کھڑا ہوا پایا۔ مگر حاسدانہ کوششوں اور کشاکش کے ساتھ حقیقی قدر افزائی نے بھی میری ذات، فن اور مستقبل پر گہرا اثر ڈالا۔

ذکر انگریز پرنسپل کا تھا میں نے اس کے سامنے کہا کہ اطلاع غلط ہے۔ میرے اس انکار پر وہ تن گیا کہنے لگا۔ بڑے قابل اعتماد آدمی نے مجھے باوثوق طریقہ پر بتایا ہے اس کی اطلاع غلط نہیں ہے میں نے دہرایا وہ مجھ سے زیادہ تو نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے آپ پر کامل اعتماد رکھتا ہوں اور ذمہ دار بھی سمجھتا ہوں۔

ممکن ہے گفتگو طول پکڑ جاتی لیکن میں بات کو ادھورا چھوڑ کر واپس چلا آیا اور راستے ہی میں اس بات کا فیصلہ کیا کہ ان حالات میں مجھے اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ اس خود اعتمادی کی بنا پر ہی میں نے استعفیٰ دے دیا۔ انگریز پرنسپل کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے ایسی جرات سے کام لیا۔ میرا استعفیٰ دیکھ کر وہ کچھ پریشان بھی ہوا۔ کالج کے اساتذہ کو بلا لیا اور بڑے خلوص سے سمجھانے لگا کہ میں استعفیٰ واپس لوں۔

اس نے میرے روشن مستقبل پر بھی روشنی ڈالی اور کہنے لگا ہو سکتا ہے تم ایک دن اس انسٹی ٹیوشن کے پرنسپل ہو جاؤ مگر زیادہ حجت نہ کی اور ایک ماہ کی تنخواہ چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا۔ یہ مالی قربانی اس وقت میرے اور میرے خاندان کے لیے معنی رکھتی تھی، بالخصوص اس وجہ سے کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے جتنے پاپڑ بیلے تھے، بہت فاصلے طے کیے تھے، بڑی ریاضت اور انتھک کوششیں کرنے کے بعد ہی یہاں تک پہنچا تھا۔

اس کے بعد میں ملازمت کے پھندے میں کبھی نہ پھنسا ہمیشہ اس جال سے بچ کر نکل گیا۔ خدا کے فضل سے کامیاب مجھے اس وقت مدراس، حیدر آباد دکن اور میو اسکول آرٹ (موجودہ نیشنل آرٹ کالج) کے پرنسپل کی اسامی کے لیے پیش کش کی گئی۔ مگر میں ملازمت کو کبھی ترجیح نہ دے سکتا تھا۔ اس لیے اس طرف سے نفور رہا۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد میرے کانوں میں عجیب قسم کی طرح کی پیشینگوئیاں بلکہ بدگوئیاں پڑتی رہیں۔ مگر میں سنی ان سنی کر دیتا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ اس وقت میری گھریلو زندگی ان جرات مندانہ اقدام کی اجازت نہ دیتی تھی۔ صرف اس ملازمت واحد کا سلسلہ تھا جس سے زندگی کو سہارا مل رہا تھا۔ مگر آفریں ہے میری محترمہ والدہ کو کہ انہوں نے میری ڈھارس بندھائی اور اس جرات کو میرے حق میں فال نیک قرار دیا اور دعا دی کہ اللہ ہمیں کسی کا محتاج نہ کرے گا۔

ہم تین بھائی ہیں۔ میں بڑا ہوں ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی منجھلے اور عبدالرحیم چغتائی سب سے چھوٹے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ میری اس جرات پر مشوش تھے۔ ایک طرح عبداللہ کا سوچنا بھی ٹھیک تھا۔ اس کا تعلق حالات کی سفاکی، غربت اور ضروریات زندگی سے تھا۔ بعض اور ذہنی عوامل بھی تھے اور یہ مزاجوں، نیز اقدار زندگی کے باب میں زاویہ نظر کے فرق سے بھی تعلق رکھتا ہے۔

بہر کیف یہ ان دنوں کی بات ہے جب ویمبلے، انگلستان میں سرکاری اہتمام سے ایک بہت بڑی نمائش فن منعقد ہو رہی تھی اور برطانوی نو آبادیات کے فنکار اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے۔ میرے کام کے نمونے بھی اس نمائش میں شریک تھے، بلکہ حصہ لینے والے فنکاروں کی تصاویر میں سب سے زیادہ میری ہی تصویریں تھیں۔ میرے فن کی شہرت اور قدردانی اب اس منزل پر پہنچ چکی تھی کہ کوئی بھی فنکار اس پر فخر کر سکتا ہے۔ خود میرے پرنسپل نے جس سے بعد کو میرا جھگڑا بھی ہوا، میرے فن کا قدردان تھا اور بڑے خوش آہنگ الفاظ میں میرے ہنر پر اظہار خیال بھی کر چکا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا کہ میں ایک نئے دبستان فن کا خالق بنوں گا اور اس طرح جدید ہندوستانی فن میں ایک نئے ردعمل کی پیشینگوئی کی جا سکتی ہے۔ ان واقعات نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا میں سوچتا تھا مجھے فن کی عظمت کو اونچا لے جانا چاہیے۔ میرے معاشرے میں صدیوں سے جو فنی اقدار نظر انداز کی جا رہی ہیں ان کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ ۱۹۲۴ء میں جب میں نے استعفیٰ دیا تو یہی رجحانات اور محرکات ذہنی تھے جو مجھے اکسا رہے تھے اور میں نے سود وزیاں کے چکروں میں پڑے بغیر مستقبل سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ عقل محو تماشائے لب بام ہی رہی اور میرا عشق فن سفاک حالات کی آتش نمرود میں بے جھجک کود پڑا۔

معاش کا چکر، ایک کبھی نہ ختم ہونے والا چکر، اپنے محور پر گھوم رہا تھا اور کئی سوتے پھوٹ رہے تھے۔ گھریلو مشکلات اور

خاندانی مسائل میرے لیے آزمائش وامتحان کے مرحلے تھے میں سوچتا تھا یہ ذاتی انسانی فرائض بھی کچھ کم اہم نہیں۔ مگر صرف ملازمت بھی کوئی بڑا اشرف ومرتبہ نہ تھا میں سوچتا فن کے فرائض بھی تو ہیں۔ وہ بھی تو میرا دامن کھینچتے ہیں۔

وہ جب میرا دامن کھینچتے تو میں پنسل پکڑ لیتا، سامنے سفید کاغذ ہوتا، تصور ابھرتے، اپنا پیکر ڈھونڈتے اور فن کے پیکر وپیراہن وجود میں آتے چلے جاتے۔ اس دور آزمائش میں قناعت سب سے بڑا سہارا ثابت ہوئی۔ میں ضمیر کی آواز کو لبیک کہتا رہا اور جذبے روشن سے روشن تر ہوتے چلے گئے۔ میں محسوس کرتا یہ گھاٹیاں طے کرنا اور یہ فراز عبور کر جانا کچھ بھی مشکل نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد اس منزل تک پہنچ جاؤں گا جہاں زندگی فراواں چشموں سے عبارت ہوگی۔ ہر شے شاداب وشادکام ہوگی، جہاں مدوجزر تو ہوں گے مگر الجھنوں کی یہ کیفیت نہ ہوگی۔

ڈاکٹر تاثیر سے میرا رابطہ بہت شروع سے تھا اور یہ زندگی کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ اس میں زندگی کی امنگیں اور بلند نظری کے اتنے امکانات کروٹیں لیتے تھے کہ ہم دیکھتے ہی دیکھتے ایک دوسرے کے قریب آ گئے، دھندلے نقوش ابھرا ابھر کر پختگی اور انفرادیت پاتے چلے گئے پھر ان روابط نے معین اشکال اختیار کرنی شروع کیں، انفرادیت اور افادیت کے پہلوؤں پر روشنی کی چھوٹ پڑنے لگی۔ ہم ان امکانات کو شناخت بھی کرنے لگے ایسے نشانات زندگی جس سے آشنا ہوئے بغیر انسان ان کے قریب نہیں آ سکتا۔

تاثیر بجائے خود ایک انجمن تھا اپنی ذات میں اور ایک انجمن وہ تھی جو اس کے دائیں بائیں جلو میں رہتی۔ میرے چھوٹے بھائی عبدالرحیم جن کا ابھی ذکر آیا، ایک دن غالب کا کوئی شعر پڑھ رہے تھے۔ تاثیر بھی بیٹھے تھے۔ رحیم کہنے لگے، تاثیر صاحب یہ تصویر ''سیاہ پوش'' غالب کے شعر کی مفسر ہے۔ اس تصور کی ترجمانی اس تصویر میں دیکھیے۔ اپنی عادت کے موافق تاثیر نے پہلے تو کچھ تامل کیا، پھر نقش کو دیکھا اور ایک دم تائید میں کلمات ادا کیے۔ کہنے لگے! رحیم صاحب آپ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ چغتائی صاحب کو غالب کے اشعار اپنی مخصوص طرز نگارش میں مصور کرنے چاہئیں۔ یہ بڑا کام ہوگا۔

بات کافی آگے بڑھی اور کچھ ہیولی بننے لگا۔ اس سے قبل میں علامہ اقبال کے بعض اشعار کو مصور کرنے کی کوشش کر بھی چکا تھا مگر غالب کے باب میں میں نے عرض کیا کہ اس کا مطالعہ نہیں، اس لیے بہتر ہوگا کہ پہلے اقبال کے کلام کو مصور صورت میں پیش کروں۔

مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔ میں تصویریں برابر بناتا رہا اور یہ تصویریں جب وجود میں آ جاتیں تو ڈاکٹر تاثیر اور رحیم غالب کے اشعار پر ان تصویروں کو منطبق کرتے۔ ان کی برجستگی وابلاغ پر گفتگو کرتے اور بہت سے فیصلے کیے جاتے، خیالات کا تبادلہ بہت سے نئے نکتے سمجھاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گزرا ہوا دن آنے والے دن کے لیے بہت سے نئے گلہائے شگفتہ دے جاتا عملی سرگرمی کا دور برابر قائم رہا۔ یہ وہ دن تھے جب اردو صحافت بالخصوص ہمارے رسائل، نئی زندگی سے روشناس ہو رہے تھے، بڑی سرگرمی اور گہما گہمی تھی۔ میرا گھر، ادب کے اداشناسوں اور احباب کے لیے ایک مرکزی جگہ بن چکا تھا، عجیب حیات پرور ماحول تھا، جدھر نظر اٹھتی زندگی نئی کروٹ لیتی اور مچلتی نظر آتی، ہر ایک کچھ نہ کچھ کر رہا تھا اور ادب وفن نئی نئی راہیں ڈھونڈ رہے تھے۔

انہیں دنوں دیوان غالب کا ایک نیا ایڈیشن جرمنی سے طبع ہو کر آیا۔ لوگ اس کی بہت تعریف کر رہے تھے، اب میں سوچتا ہوں وہ ایڈیشن ہی میری اور تاثیر کی گہری دوستی کا موجب بنا۔ اس میں غالب کی ایک شبیہہ بھی لگی ہوئی تھی۔ تاثیر نے جب مجھے وہ تصویر دکھائی تو میں نے اس کی بہت بری طرح مذمت کی اور کہا کہ اس تصویر کا چھپنا شاعر کے دونِ مرتبت ہے۔ اس بات کا تاثیر پر بڑا اثر ہوا اور اس نے گھر پہنچنے سے پہلے اس تصویر کو پھاڑ کر دیوان سے الگ کر دیا اور دوسرے دن اپنے اس ردعمل کی کہانی مجھے سنائی۔ اس

کے بعد آرٹ سے اس کا لگاؤ بڑھتا چلا گیا۔ ''بنگال سکول'' کی تحریک فن اس وقت زوروں پر تھی۔ جدید ہندوستانی آرٹ پر اس کا جادو چل رہا تھا۔ ہر جگہ اس کا چرچا تھا۔ فنی نقطہ نظر سے ہم نے بھی اسے پرکھا جانا اور حسب موقع خالص مشرقی نقطہ نگاہ سے اسے سراہا بھی۔

میرے فن میں تاثیر کی دلچسپی برابر بڑھ رہی تھی اور اس نے ''نیرنگ خیال'' ہی کے ذریعے نہیں اور بہت سی جگہوں پر بھی اس سلسلے کو بڑھایا۔ ہر موقع پر اس کا وسیع مطالعہ علم و فن اپنا نقش چھوڑ جاتا تھا میرا خیال ہے کہ فن پر لکھنے والے نقادوں میں اس جیسی پہنچ اور سوجھ بوجھ کا کسی اور نے ثبوت نہیں دیا۔

میں غالب کے اشعار کی تصویری تفسیر کا ذکر کر رہا تھا یہ تصاویر برابر بن رہی تھیں، اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ مگر میں ابھی تک اس خیال کا ہی موید تھا کہ اگر ہمیں کچھ کرنا ہی ہے تو پہلے اقبال کے کلام کو مصور کرنا چاہیے تاکہ وہ روایات جو تین چار سو سال سے نظر انداز کی جا رہی تھیں ان میں پھر سے زندگی پیدا ہو۔ مگر اس مرحلہ پر علامہ اقبال کے ایک قریبی محسن و محب نے رائیلٹی کا سوال پیدا کر دیا تھا اور یہاں سے مسئلہ دوسرا رخ اختیار کرتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا میرے فن نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی پھر بھی ہم حالات کی تنگنائے میں سے بہت مشکل سے گزر رہے تھے اور ایسے مراحل سے دوچار تھے جن کا علم ہم تینوں بھائیوں کے سوا کسی کو نہ تھا۔ زندگی کے تقاضوں نے بری طرح زچ کر رکھا تھا۔ شب و روز ہم اونچی پرواز کے لیے پر تولتے تھے، اڑنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ مگر پھر مسکرا کر رہ جاتے تھے۔ زندگی ایسی ہی افتادوں کا نام ہے۔

غالب کا مصور نسخہ مکمل کرنے کا خیال میرے چھوٹے بھائی، رحیم کے دل میں ایسا سمایا کہ وہ برابر اس دھن میں لگا رہا اور اس لگن نے ہی مجھے بھی کام پر لگائے رکھا، غیب سے ''مضامین'' خیال میں آتے رہے اور مرقع کی شکل بنتی چلی گئی۔ ایکا ایکی مدراس کے مشہور نقاد فن، ڈاکٹر جیمز کزنز نے میری کچھ تصویریں حاصل کرنے کا تقاضا کیا۔ وہ یہ تصاویر مہارانی کوچ بہار کے محل کے لیے خریدنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کے سامنے ایک پبلیکیشن کا تصور پیش کیا اور کچھ تجویزیں سامنے رکھیں۔ مگر ابھی یہ خط و کتابت آپس میں ہی تھی کہ مہارانی کوچ بہار نے ایک قدر شناس کی حیثیت سے مجھے پانچ ہزار کا چیک روانہ کر دیا تاکہ میں اپنے پروگرام پر دلجمعی کے ساتھ کام کر سکوں۔ حالات کے پیش نظر اس وقت کے یہ پانچ ہزار ہمارے لیے گویا پانچ لاکھ سے کم نہ تھے۔ اس کی خبر جب میری والدہ صاحبہ کو پہنچی تو وہ فرمانے لگیں کہ یہی تو میرا وہ سہانا خواب تھا جو میں دیکھ رہی تھی۔

''نیرنگ خیال'' کی مقبولیت حکیم یوسف حسن کے تعاون اور ڈاکٹر تاثیر کی کاوشوں نے بڑی مدد کی اور ہر موڑ پر اپنی ہمدردی، خلوص اور پاک طینتی کا ثبوت دیا۔ ان دنوں ڈاکٹر تاثیر، بدرالدین بدر، ڈاکٹر نذیر اور غلام عباس تقریباً ہر وقت میرے گھر پر موجود رہتے کبھی کبھار حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، مجید ملک، پطرس بخاری اور سید امتیاز علی تاج بھی رونق بزم بنتے اور غالب کی اشاعت کے سلسلے میں اپنی دلچسپی کا اظہار فرماتے۔ اکثر کوئی نہ کوئی نئی بات ہاتھ آتی وہ ہمدردیاں، خلوص، وہ ہنگامہ پرور فضائیں جن کی طرف ایک دنیا کی نظریں لگی رہتی تھیں جب یاد آتی ہیں تو دل کہتا ہے کاش وہ ماضی واپس آ سکتا۔ مگر ماضی کبھی واپس نہیں آتا۔ کسی قیمت پر یہ جنس حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں ان دوستوں کی بلند نگاہی کے طفیل اپنی دھن میں لگا رہا اور ایسا ڈول ڈالتا رہا کہ مرقع چغتائی اپنا معیار آپ ہو، اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہو کہ اک خلق ''اس کے گرد آوے'' پورا برصغیر یک زباں ہو کر اس کی داد دے اور باہر بھی وہ قدر و منزلت ہو کہ فن کی لاج رہے اور یہ کہا جا سکے کہ اب تک اس بلند معیار اور ذوق کی کوئی دوسری کتاب اس برصغیر سے پیش نہ ہوئی تھی۔

میری تصاویر کا چرچا اب کافی دور دور پہنچ چکا تھا مہاراجہ پٹیالہ کو بھی میرے فن نے اپنی طرف متوجہ کیا اور میرے ارادوں

کا علم ہونے پر انہوں نے میری تصویریں خریدیں اور اچھی خاصی رقم عنایت کی جس کی وجہ سے یہ قطعی ہو گیا کہ ''مرقع چغتائی'' شائع ہو سکے گا۔

''نیرنگ خیال'' کی سرگرمیاں تو اس سلسلے میں جاری تھیں کہ ''انقلاب''، ''احسان''، ''زمیندار''، ''ہمایوں''، ''عالمگیر''، ''مخزن''۔ نیز دہلی اور حیدر آباد دکن کے اخبارات و رسائل نے بھی میری تحریک فن کا پر جوش خیر مقدم کیا اور ان سب نے اپنا تعاون بھی دیا۔ پھر یہ تحریک و تصور اس قدر آگے بڑھ گیا کہ اگر ہم چاہتے بھی کہ مرقع چغتائی طبع نہ ہو، تو ایسا نہ کر سکتے تھے! اس کے بعد ایسے حالات خود بخود ظہور میں آئے کہ سوائے دیوان غالب مصور کی تکمیل کے اور کوئی کام میرے لیے نہ رہا میں جو کبھی مصروفیتوں کی تلاش میں رہتا تھا، اب اتنا مصروف تھا اور کام میں ایسا گھرا ہوا محسوس کرنے لگا کہ سارے فرائض کو سرانجام دینے میں دشواری معلوم ہوئی۔

تصویروں کے بلاک، تصویروں کی حفاظت دیوان کی تصحیح۔ دیوان کو کسی اعلیٰ خطاط سے لکھوانا پھر اس کتابت سے بلاک بنوانا، آرائش و حسن کاری کے لیے نئے نئے ڈیزائن تیار ہونا ایک دوسرا دوسر تھا۔ پھر کتاب کی جلد بندی کا کام تھا۔ طباعت کے لیے خاص الخاص قسم کے کاغذ کی فراہمی راہ کا ایک اور سنگ گراں تھا۔ غرض ہر قدم توجہ اور کوششوں کا محتاج تھا۔ ذوق نظر اور کد و کاوش کے علاوہ بے دریغ خرچ کا بھی سوال تھا۔ واقعات و ضرورت نے مل کر حسب ضرورت روپیہ بھی فراہم کر دیا۔ غالب کے مصور ایڈیشن کے سلسلے میں زر تبادلہ کا مسئلہ رائیلٹی کا قصہ بھی نہ تھا۔ غرض کلام اقبال کے سلسلے میں جو حائیلات تھے وہ اگر غالب کے سلسلے پیش آتے تو بھلا یہ مرقع کیسے منصۂ شہود پر آتا۔

رحیم نے اگر مرقع چغتائی شائع کرنے کے لیے مجھے اکسایا تھا تو اس نے اس کا سارا بار بھی خود اٹھایا اور بڑے سلیقے سے ان کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ مرقع چغتائی جیسی کتاب اس وقت اردو کی سفیر بنی ہوئی ہے اور دنیا کے ہر اہم مرکز علم، ادب و فن نیز لائبریریوں، عجائب خانوں اور فنی نگار خانوں میں موجود ہے اس کے معیار نے مشرق کے آرٹ اور اردو کو پہلو بہ پہلو پیش کیا ہے اور اس کی اہمیت نے اردو کو بین الاقوامی مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔

اب مراحل تیاری کی داستان بھی سن لیجیے۔ سب سے پہلے کاتب کی تلاش ہوئی۔ ڈاکٹر تاثیر اور میں نے لاہور کے کئی مشہور خطاطوں کو اس کام کی اہمیت جتلائی اور منہ مانگی رقم دینے کا بھی یقین دلایا مگر ہوا یہ کہ ہمارے الفاظ یہاں آ کر بے اثر ہو گئے، جب ایسا نظر آیا تو بھائی عبدالرحیم نے خود ہی قدیم طرز خط کے استاد منشی اسداللہ کا انتخاب کیا اور یہ بیل منڈھے چڑھی۔ انہوں نے ہماری ضرورت کو سمجھا، کام کی نوعیت کو جانا اور پھر ایسی جانفشانی و محبت سے اس کام میں شریک ہوئے کہ آخری لفظ لکھنے تک ان کا وہی شوق و جذبہ کارفرما رہا۔ بحمداللہ آج بھی دنیا ان کے اس کام سے مطمئن ہے۔ اس وقت مرقع چغتائی کے ان کاتب، بابا اسداللہ صاحب کی عمر ۶۵ سال کے لگ بھگ تھی۔

آج بلاک بنوانے اور ایسی کتابیں چھاپنے کے لیے کافی سہولتیں موجود ہیں۔ ایسے پریس اور بلاک ساز و صناع بھی ہیں جن پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں جن دنوں کی بات کر رہا ہوں وہ اور وقت تھا اس وقت اپنی نوعیت کا یہ کام اکیلا ہی تھا اور اتنا مشکل اور پیچیدہ کہ اس کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ بلاک سازی اور چھپائی کی اعلیٰ مشینیں خود فراہم کریں اور یہ سارا فنی کام بھی خود سنبھالیں اس ضمن میں جو جو پریشانیاں، تکلیفیں اور سنگ گراں حائل ہوئے ان کا آج تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ہم نے ہمت نہ ہاری اور مشکلوں کے حل تلاش کرتے رہے۔ میرے ماموں زاد بھائی معراج الدین صاحب اور میرے چھوٹے بھائی عبدالرحیم چغتائی نے جس تندہی اور حق شناسی کا ثبوت دیا وہ میری انتہائی عزیز یاد ہے۔ یہ علمی ادبی اور فنی نوعیت کی خدمت تھی، کوئی خزانہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

اس کام کے سلسلے میں جب پروقار الفاظ اور وقیع آوازوں نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا تو اس وقت کی انگریز حکومت بھی کچھ متوجہ ہوئی۔ لارڈ لن لتھ گو اور لارڈ پیلی فوکس وائسراؤں نے جہاں سر فضل حسین اور سر سکندر حیات خاں جیسے مشیروں سے میری بابت مشورہ کیا اور ان بزرگوں نے حکومت انگلشیہ سے میرے لیے ''نائٹ ہڈ'' کی سفارش بھی کی مگر لطیفہ یہ ہوا کہ فن کی منزلت تو دھری رہ گئی اور میری ناداری اور پرانے لاہور کی چار دیواری میں رہائش کی قید سامنے آ گئی۔ چنانچہ ''سر'' بدل کر خان بہادر کی شکل اختیار کر گیا! مگر اس پر بھی علمی حلقوں نے یہ احساس دلایا کہ فن کی کچھ تو پوچھ ہوئی مثلاً ''ٹائمز آف انڈیا'' نے ہی لکھا کہ اس ایک صدی کے عرصہ میں یہ تیسرا خطاب ہے جو علم و فن کے سلسلے میں حکومت ہند نے جدید ہندوستانی آرٹ کے ایک نامور فنکار کو دیا ہے۔ یہ اعزاز تو خیر تھا ہی مگر میں جسے عزیز تر سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے مخلص دوستوں اور رفقائے کار نے آخری دم تک میرا ساتھ نہ چھوڑا اور جو بھی برگ و بار آئے انہیں کی مساعی خلوص کا نتیجہ تھا۔

جن دنوں غالب کا مصور ایڈیشن ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا میں تاثیر کو بار بار یاد دلا رہا تھا کہ وہ وقت کے تقاضے کے مطابق اس پروگرام کو عملی شکل دیں جو ان کے ذہن میں تھی۔ عبدالرحمٰن بجنوری کی بعض ابتدائی کوششوں کے پیش نظر وہ کچھ اور کام سوچ رہے تھے۔ وہ بعض ایسی باتوں کو سامنے لانے والے تھے جن پر پہلے عمل نہ ہوا تھا مگر افسوس کہ آرزوؤں کی بلندی کے باوجود انہیں سرانجام نہ دے سکے۔ علم و ادب کا تو خیر نقصان ہوا ہی مگر مجھے اس کا بڑا افسوس رہا۔ مگر ان کی ذات سے مجھے یہ فائدہ برابر ہوتا رہا کہ کام کے سلسلے میں وہ مہمیز ثابت ہوئے میں نے ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے اس مرقع کے لیے سخن ہائے گفتنی خود تحریر کیا تھا۔ یہ ایک تعارف ہے اس تعارف کا مقصد یہ تھا کہ ایک خاص طبقہ اہل ذوق و نظر اس نہج فن کی طرف کھنچے اور اس میں وہ فنی شعور و ادراک پیدا ہو جو میرا زاویہ فکر تھا اس میں شک نہیں کہ یہ سخن ہائے گفتنی اس بارہ خاص میں کامیاب ہوا ہو یعنی یہ کہ ترقی پسند عناصر فن اور ذوق جمال کی تسکین و تلاش کرنے والوں میں احساس پیدا ہو گیا۔

میرے بھائی عبدالرحیم اور ڈاکٹر تاثیر نے مصور نسخہ غالب کی جو داغ بیل ڈالی تھی وہ چھ سات روپے کا ایک مصور ایڈیشن تھا مگر کتاب پر پچیس ہزار کے قریب خرچ آ چکا تھا۔ جب نوبت یہ پہنچی تو پھر قیمت کا سوال ایک اور ہی طرح ذہن میں آیا۔ میرے سامنے یورپ کی بعض فنی مطبوعات تھیں۔ مگر میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اپنے ملک میں بدذوقی یا کم مائیگی کے باعث پوری طرح خیر مقدم نہ ہوا اور یہ ایڈیشن یونہی پڑا رہا تب بھی وہ ایک یادگار چیز ضرور ہوگا، ایک ناقابل فراموش یادگار۔ اس بات پر کافی سوچتا رہا اور آخر الامر یہ تجویز پیش کی کہ اس کا ایک خاص الخاص (ڈی لکس) ایڈیشن الگ تیار ہو جس کی قیمت ایک سو دس روپے مقرر کی گئی اور یہ بھی کہا گیا کہ اس کی صرف دو سو دس کاپیاں شائع ہوں گی۔ بعض دوستوں نے اس پر مجھے آنکھیں دکھائیں، کسی نے ہنسی اڑائی اور بعض نے کہا اردو پڑھنے والے ابھی چھ سات روپے کی کتاب پڑھنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ ایسا گراں قیمت نسخہ کیسے خریدیں گے؟ میں نے جواب دیا یہ سب ٹھیک، مگر میں نے اپنے فن کے بل بوتے پر اتنا بڑا حوصلہ کیا ہے اور اسے ایسا ہی بنا رہا ہوں اب یہ مرقع ایسے سانچے میں ڈھل چکا ہے کہ اردو نہ جاننے والے بھی اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور خلوص کے ہاتھ اس کی طرف پھیلیں گے۔ غالب کے پرستاروں کی دنیا بھی ایسی گئی گزری نہیں ہے وہ بھی شعر و فن سے اپنے لگاؤ کا عملی ثبوت دیں گے۔

بہر کیف غالب کے مرقع چغتائی خاص ایڈیشن کا اعلان کر دیا گیا۔ آرڈر آنے شروع ہو گئے ہر مذہب و ملت کے لوگوں غریبوں اور امیروں نے سب نے ہی آرڈر بھیجے۔ یہ خاص ایڈیشن شائع ہونے سے پہلے ہی فروخت ہو چکا تھا۔ ایک تاجر کو اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کا پورا حق بھی تھا اور موقع بھی۔ مگر ہم کاروباری ہتھکنڈوں سے قطعی ناواقف اور تجارت کے فن میں کورے تھے

اس لیے یہ موقع بھی ہمیں کچھ نہ دے سکا۔

میں اپنے قدردانوں اور ان ذی شعور لوگوں کا ذکر کیا کروں جن میں سے ہر ایک کا خلوص، دیدہ وری اور فن آگاہی میرے لیے معاون ثابت ہوئی اور میرا آرٹ پنپا، بہرنوع یہ ضرور ہے کہ میرے خاندان کے مسائل اور بے اطمینانی ایک حد تک ضرور ختم ہو گئی۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ میرے فن کے تقاضے مجھے برابر یہی کہتے رہے کہ ان دیانتدارانہ کوششوں میں ایسی کوئی بات نہ آنے پائے جو انتشار حالات کا باعث ہو اور میں پھر ایسی جرات ہی نہ کر سکوں یوں تو ہر ایک خواہاں تھا کہ میری یہ تخلیقی کوششیں ایک مرتب کتاب کی شکل میں آ جائیں اور یہی عوامی تقاضے میرے لیے بہت بڑی ڈھارس تھی۔ مرقع چغتائی جیسی کوئی کتاب اردو میں نہ تھی مگر جب اس کا غلغلہ بلند ہوا تو اس جنس کے خریدار بھی نہ جانے کہاں کہاں سے پیدا ہو گئے۔ فن کا عالم یہ تھا کہ میری تکنیک بالکل نئی اور جدا تھی، نگارش کا انداز اجنبی پر اسرار خطوں کی کشش اپنا انفرادی اپیل رکھتی تھی۔ یہ سب باتیں چونکانے والی تھیں۔ انہوں نے اپنی جگہ خود بنائی اور جدید ہندوستانی آرٹ میں ایک نئے تجربہ کا اضافہ ہوا۔ فن میں وہ قنوطیت جو بدھ اور بدھ کی سادھی سے آگے نہ بڑھ سکی تھی، اس سے گریز شروع ہوا۔ ہم عصر مصوروں کے سامنے یہ انوکھی چیز لا کر کچھ کام کر دکھانا ویسے بھی کوئی آسان مرحلہ نہ تھا مگر ایرانی، مغل اور اجنٹا روایات کے سہارے میں نے اپنے فنی موقف کے لیے وہ جگہ ضرور نکالی جو ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوئی یہ تحسین فن کی ایک نئی کاوش تھی، اس نے رمز نگاری و رمز شناسی کا چلن پیدا کیا اور آرٹ نے نیا مرتبہ پایا۔

اپنے فن کے سلسلے میں چند باتیں عرض کروں۔ میرے بعض نقوش بالکل انفرادی ہیں۔ میں نے اپنے نقوش میں مشرقی رموز بھی پیدا کیے ہیں۔ نیز علامتیں ہیں جو ہماری ثقافتی ثروت کی نشانیاں ہیں۔ میں نے بعد میں بھی کچھ تجربے کیے اور انہیں نیا پن دیا۔ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے یہ وہ لوگ تھے جو نئی نئی تحریکوں، نئی باتوں، رجحانوں اور انکشافات سے دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ فن اور ثقافت کے دائرہ کار کو وسیع کرنا چاہتے ہیں اور اس ضمن میں وہ کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ ذوق نظر نے ہمیشہ روح حیات کا ساتھ دیا ہے اور دیتا رہے گا مگر کام کرنے کا وہ زمانہ شاید اب مشکل ہی سے ہاتھ آئے جیسا کہ عرض کیا میں سب قدردانوں اور مداحوں کے خلوص دل کا معترف ہوں۔ خواص بھی اور عوام بھی۔ انہیں نے اس مرقع کو پیش کرنے کے اسباب پیدا کیے۔ خواص کے ذکر میں میں مہارانی کوچ بہار کا نام لے چکا ہوں، جو سرفہرست ہے پھر ان کی والدہ محترمہ، مہارانی بڑودہ ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ، سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد دکن، مہاراجا شمشیر جنگ بہادر نیپال وغیرہ۔ ان لوگوں کی قدردانی سے مرقع کو وجود بخشنے میں مدد ملی بعض وہ نام بھی ہیں جن کا ذکر بصد احترام کرنا ضروری ہے۔ مثلاً سر تیج بہادر سپرو، سر سالار جنگ بہادر، سر عبدالقادر، نواب احمد یار خاں دولتانہ، سر کرشن پرشاد شاد، میاں نظام الدین بارود خانہ لاہور وغیرہ ان سب نے میری کوششوں کو سراہا۔

جب مرقع چغتائی پہلی بار تیار ہوا تو اس کی ایک جلد دربار غالب میں اس طرح پیش کی گئی کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے پائیں شاعر کے مرقد پر نذرانہ عقیدت رکھ دیا گیا یہ ان کی خدمت میں خراج تھا ایک فنکار کا اور یہ امانت ان تک پہنچا دی گئی۔ مگر معلوم نہیں وہ کون بے باک تھا جو اس خراج عقیدت کو بیچ بیٹھا۔ معلوم نہیں اس وقت یہ امانت کس کے پاس ہے؟

یہ سب تو ہوا۔ امیدوں سے بڑھ کر قدر افزائی ہوئی مگر تجارتی چکر سمجھ میں نہیں آیا اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہم ان باتوں کی طرف دیکھتے رہے اور عجب احوال رہا۔ عام ایڈیشن سے بڑے بڑے امکانات وابستہ تھے۔ مگر ہوا وہی کہ سرمایہ دار تاجر اپنا کام کر گیا اور ان باتوں کی نافہمی سب کچھ چٹ کر گئی، جمالیاتی قدریں اور امنگیں ترستی رہیں۔

﴿بشکریہ ماہنامہ تہذیب الاخلاق﴾

# بیگم آل احمد سرور سے خصوصی ملاقات

آزرمیدخت صفوی

سرُور نمبر کے قارئین کے لیے بیگم آل احمد سرور سے خصوصی ملاقات اور انٹرویو کے اقتباسات ایک مخصوص پیش کش ہیں۔ سرور صاحب کی علمی اور ادبی زندگی کے پہلوؤں پر لکھنے والے بہت ہیں جنہوں نے مختلف رسائل اور جرائد میں ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان کی ذاتی زندگی، ان کے جذبات اور احساسات، بچوں اور گھر والوں سے ان کے روابط اور خود بیگم سرور سے ان کے گہرے قلمی تعلق کا آئینہ بیگم سرور کی یہ گفتگو ہے جس کو پیش کرنے کا شرف صرف فکر و نظر کو حاصل ہو رہا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ شاید سرور صاحب کی اپنی خودنوشت میں ان کی شخصیت ایسے جاذب اور جیتے جاگتے انداز میں ابھر کر سامنے نہیں آئی جیسی اس مختصر گفتگو میں نظر آتی ہے۔ علالت اور ضعف کے باوجود بیگم سرور نے آڈیٹر فکر و نظر سے تقریباً ۴ گھنٹے گفتگو کی، جس کو ریکارڈ کیا گیا۔ ان کی حیرت انگیز یادداشت اور بے ساختہ انداز نے سرور صاحب کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں جان ڈال دی ہے۔ بیگم سرور کی یہ گفتگو کہیں شگفتگی سے بھرپور ہے تو کہیں دل گداز: خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔

بیگم سرور کی زبان سے سرور صاحب کی ایسی بہت سی نظمیں بھی نقل کی جا رہی ہیں جو خالص ذاتی نوعیت کی ہیں اور اب تک کہیں شائع نہیں ہوئیں۔

حسن اتفاق سے اس انٹرویو کے وقت سرور صاحب کی صاحب زادی مہ جبیں اور نواسی رخشندہ بھی موجود تھیں۔ وہ بیگم سرور کو بہت سی باتیں یاد دلوا رہی تھیں اور گاہے گاہے گفتگو میں حصہ لے رہی تھیں۔ بیگم سرور کے علاوہ ہم ان دونوں کے بھی نہایت ممنون ہیں۔

آ۔د: آپ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

ب۔س: میری پیدائش بدایوں میں ہوئی۔ میرے گھر کا نام شیش محل تھا جس کا کچھ حصہ اب بھی برقرار ہے۔ میرے والد کے چچازاد بھائی اور ان کے بچے اب بھی وہاں رہتے ہیں۔

آ۔د: آپ کے والد کیا کرتے تھے؟

ب۔س: میرے والد کلکٹر تھے۔ ان کا نام رحمٰن بخش قادری تھا۔ میری تین مائیں تھیں۔ پہلی بیوی کی موت کے بعد میرے والد نے دوسری شادی کی تھی۔ میری ماں کا جب انتقال ہوا میں شاید ڈھائی سال کی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ وہ ٹی۔بی کی مریض تھیں۔ میرے ماں باپ آپس میں رشتے دار تھے۔ میرے والد کا ٹرانسفر ہوتا رہتا تھا۔ گورکھپور، سہارن پور، آگرہ اور بنارس میں رہے۔ دو بار الہ آباد ٹرانسفر ہوا۔ الہ آباد میں بھگت سنگھ اور فیروز گاندھی سے ملنا جلنا ہوتا تھا۔ فیروز گاندھی جیل گئے تھے تو سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی میرے والد نے ان کی مدد کی تھی۔

آ۔د: سرور صاحب کا آبائی وطن کہاں ہے؟

ب۔س: بدایوں میں ہے۔ وہ مولوی ٹولے میں رہتے تھے۔ ان کا ایک مکان بک گیا تھا۔ دوسرے کا بھی مردانہ حصہ بیچ دیا ہے اور زنانہ باقی ہے۔

آ۔د: کیا آپ شادی سے پہلے سرور صاحب کو جانتی تھیں؟

ب۔س: ہاں جانتی تھی کیونکہ وہ بھی بدایوں کے تھے۔ ان کا ذکر ہمارے یہاں ہوتا تھا۔ ان کی بڑی بہن میرے پھوپھی زاد بھائی کی بیوی تھی اور میرے پھوپھی زاد بہن ان کی منگیتر تھی لیکن اس لڑکی کا انتقال ہو گیا تھا۔

آ۔د: کیا شادی سے پہلے آپ نے سرور صاحب کو دیکھا تھا؟

ب۔س: کوئی خاص ملاقات نہیں تھی۔ بس ایک دو دفعہ دیکھا تھا۔ ہماری دوسری بہن کی شادی تھی۔ ہمارے اور پھوپھی کے گھر کے بیچ میں ایک بڑی کھڑکی تھی۔ ہم لوگ بڑے جوش میں اس کھڑکی پہ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک سرور صاحب اور ان کے بڑے بھائی ابن احمد پھوپھی کے گھر میں داخل ہوئے۔ ان لوگوں کی نظر ہم پر پڑی اور ہماری نظر ان پر پڑی۔ ہم فوراً اندر چلے گئے۔ بس دو ایک دفعہ ایسے ہی دیکھا تھا۔

آ۔د: آپ کی شادی کب ہوئی؟

ب۔س: ۳ راگست ۱۹۳۶ء کو میری شادی ہوئی۔ سرور صاحب کی والدہ تنویر فاطمہ اور خالہ طفیل فاطمہ نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ چونکہ سرور صاحب کی Joint family تھی، ساس، سسر، دیور وغیرہ سبھی ساتھ رہتے تھے۔ اس لیے مجھے اکیلا پن کبھی محسوس نہیں ہوا۔

آ۔د: شادی سے پہلے سرور صاحب کے بارے میں آپ کے ذہن میں ایک تصور رہا ہوگا۔ شادی کے بعد وہ آپ کو کیسے لگے؟

ب۔س: (ایک طویل قہقہہ)..... وہ بہت گورے تھے تب۔ ان کے خاندان میں سب سانولے ہیں۔ ۲۵۔۳۰ سال کی عمر تک ان کے بال سفید ہو گئے تھے۔ جب ہم رام پور گئے تھے تو لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان کی دوسری بیوی ہیں۔ اولاد احمد بھی ہمارے ساتھ تھے۔ رام پور والوں کو لگا کہ یہ ان کی پہلی بیوی کے بچے ہیں۔ ایک دلچسپ بات سنو۔ شادی کے بعد ہم گھونگھٹ نکالے بیٹھے تھے۔ سرور صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور پوچھنے لگے ''آج چاند کس کے پاس ہے؟'' میں نے سوچا شاعر آدمی ہیں کیا جواب دوں، بے اختیار کہہ دیا ''میرے''!

آ۔د: شادی کے بعد سرور صاحب کی ادبی مصروفیات کیا تھیں۔ گھر میں ان کے کیا معمولات رہتے تھے۔ گھر کے کام میں وہ آپ کا ہاتھ بٹاتے تھے؟

ب۔س: شادی سے پہلے ان کی ایک کتاب ''سلسبیل'' چھپ چکی تھی۔ وہ پہلے ہی establish ہو چکے تھے۔ ان کا اصل نام آل احمد صدیقی ہے اور سرور تخلص تھا۔ شادی کے بعد میں مسز سرور ہو گئی۔ ہمارے یہاں رات کے گیارہ بجے تک سب سو جاتے تھے۔ وہ رات کو دیر تک جاگتے تھے اور پڑھتے لکھتے رہتے تھے۔ ہمارے یہاں بجلی نہیں تھی۔ اس وقت کہیں بجلی نہیں تھی۔ سب کے یہاں لالٹینیں جلتی تھیں۔ ہمارے یہاں بھی رات بھر لالٹینیں جلتی رہتی تھیں۔ گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ ہمارے ساتھ اکثر shopping کو جاتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ تر کہاں بیٹھ کر کرتے تھے؟ پڑھتے یا لکھتے وقت کیا وہ کسی خاص جگہ بیٹھنا پسند

کرتے تھے؟

ب۔س: وہ اکثر گھریلو ماحول کے بیچ میں لکھتے پڑھتے تھے۔انہوں نے الگ سے کوئی study نہیں بنوائی تھی۔ان کی ایک typical chair ہے جس کے ہاتھ نکلے ہوئے ہیں۔اپنی ساری کتابیں اور سارے مضامین لکھنے کے بعد اسی پر رکھتے تھے۔ان کا concentration بہت زبردست تھا۔جب لکھ رہے ہوتے تھے تو اس وقت نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔شور وہنگامہ ہو تو تنہائی میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔زیادہ تر تو رات ہی کو لکھتے تھے۔

آ۔د: آپ آخری بار بدایوں کب گئیں؟

ب۔س: ۱۹۸۷ء میں آخری بار بدایوں گئی تھی۔میری خالہ کا انتقال ہوگیا تھا۔میں اکیلی گئی تھی۔سرور نہیں گئے تھے۔وہ اس سے پہلے گئے تھے۔بدایوں میرا دل ہے۔

رخشندہ: ابا کو علی گڑھ سے عشق تھا۔اس لیے وہ علی گڑھ میں رہنا پسند کرتے تھے۔

آ۔د: کبھی آپ دونوں میں آپس میں لڑائی ہوتی تھی؟ آپ خفا ہوتی تھیں یا وہ آپ سے خفا ہوتے تھے۔

ب۔س: ہاں، بہت لڑائی ہوتی تھی (اس پر کبھی ہنس دیے) طبیعت زیادہ تر خراب رہتی تھی۔وہ اس بات پر ناراض ہوتے تھے کہ آپ وقت پر دوا نہیں لیتی ہیں۔وہ اکثر دوا اور ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے کھڑے رہتے تھے اور میں الٹا انہیں ڈانٹتی تھی کہ یہ کیا میرے پیچھے پڑے ہو دوا لے کر۔اکثر غصے میں برتن توڑ دیا کرتے تھے۔ایک بار میں نے بھی غصہ میں آ کر ان سے زیادہ برتن توڑ دیے۔ہماری ایک برتن کی الماری تھی۔اب بھی وہ ٹوٹی ہوئی موجود ہے۔اس میں برتن رکھے رہتے تھے۔اس وقت بڑے عمدہ انگریزی سیٹ ہوتے تھے۔سرور نے ایک پیالی غصے میں اٹھا کر پھینک دی۔ہمیں بھی غصہ آیا۔ہم نے پورا سیٹ توڑ دیا۔اچھی بات یہ ہوئی کہ پھر انہوں نے برتن پھینکنا ہی چھوڑ دیا۔

آ۔د: آپ کی ترکیب کام آ گئی۔

ب۔س: جی بالکل کام آ گئی۔میں اس پر بھی ناراض ہوتی تھی کہ وقت پر کھانا کھالیں لیکن وہ اس کا خیال نہیں رکھتے تھے۔دوست احباب کے ساتھ باتوں میں الجھ گئے تو کھانا پینا بھی بھول گئے۔چار چار گھنٹے بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔دوستوں کے آنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔کوئی آٹھ بجے آ رہا ہے، کوئی نو بجے اور کوئی ایک بجے۔کھانا میز پر لگا ہوا ہے اور یہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔اس سے میرا موڈ آف ہو جاتا تھا۔اس سے بڑی کھینچا تانی ہوتی تھی۔کبھی کبھی بول چال بھی بند ہو جاتی تھی۔وہ بچوں سے message بھجوایا کرتے تھے۔لیکن بات کرنے کی پہل ہمیشہ وہی کرتے تھے۔شروع میں سرور ان باتوں پر بھی بہت ناراض ہوتے تھے جیسے وقت پر چائے نہ ملی ہو یا پان صحیح نہ بنے ہوں۔اس پر انہوں نے ایک چھوٹی سی نظم بھی کہی تھی:

کیا بتاؤں آج کل گھر میں یہ کیا اندھیر ہے — چائے آنے میں تکلف ناشتے میں دیر ہے
ریڈیو کھولے ہوئے بیٹھا ہے کوئی اس طرح — اہل ایماں حوض کوثر کے کنارے جس طرح
کوئی خراٹوں کی کرتا ہے عجب بستر پہ مشق — کوئی انداز جنوں کی کر رہا ہے گھر میں مشق

بعد میں ان کا غصہ بہت کم ہوگیا تھا۔

آ۔د: سرور صاحب شعر کہتے تھے تو آپ کو سناتے تھے؟

ب۔س: کوئی شعر کہتے یا کوئی کتاب چھپتی تو پہلے مجھ کو دیتے تھے۔ میرے اوپر انہوں نے بڑی لمبی لمبی نظمیں کہیں ہیں۔ مجھے ابھی تک وہ مہندی یاد ہے جو انہوں نے میرے لیے کہی تھی:

لگا لو نازنیں ہاتھوں میں اپنے زاہدہ مہندی — بتائے گی تمہیں عیش و مسرت کا پتہ مہندی
دلھن کیا ہے سراپا حسن کی تصویر ہے بالکل — دوبالا اور بھی اس کو کرے گی خوشنما مہندی
سجا کر لائی ہے مالن اسے پھولوں کی کشتی میں — دلھن کا حسن بھی دلکش ہے اور ہے خوشنما مہندی

سرور نے ماہ جبیں کے لیے ایک نظم لکھی تھی جسے وہ بچپن میں بہت گاتی تھی:

میری بیٹی جب بڑی ہو جائے گی — سارے گھر میں روشنی پھیلائے گی
ماں کی نظروں میں جوانی آئے گی — باپ کے دل کی کلی کھل جائے گی
میری بیٹی جب بڑی ہو جائے گی — حور جنت خود نچھاور لائے گی
سادگی معصومیت بن جائے گی

گھریلو نظمیں بہت کہتے تھے اور پڑھ کر سناتے تھے:

دفتر کے کام کا نہیں دادے کو کچھ بھی دھیان — بھولی ہوئی ہیں اپنی علالت کو دادی جان
ماں کو ہوا ہے فرط مسرت سے اختلاج — اچھی تو ہیں پر ان کو دوا کی ہے احتیاج
چولہے کے پاس بیٹھی ہے مریم کڑھی لیے — تسنیم بھی وہیں پہ ہے اپنی ہنسی لیے

(تسنیم سرور کی بہن ہے جو پاکستان میں رہتی ہے اور مریم بھانجی ہے)

ہمارے ایک چچا تھے رضوان جن کی داڑھی تھی۔ سرور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کا سہرا بھی لکھا تھا:

رضواں پہ بھی اک رند خرابات کا عالم — داڑھی میں چھپائے ہوئے جذبات کا عالم
یخ بستہ دلوں میں بھی حرارت ہوئی پیدا — اللہ رے ساقی کی کرامات کا عالم

ان کے ایک چچازاد بھائی تھے جو ننھے میاں کہلاتے تھے۔ یہ کشمیر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ننھے میاں کی پہلی سالگرہ پر ایک نظم کہی:

کشمیر میں بھی قلب و نظر جگمگا گئی — ننھے میاں کی سالگرہ یاد آ گئی
جلووں کا اک جہان نگاہوں میں ہے مری — میرٹھ کی ایک شام نگاہوں میں ہے مری
گھر میں ہر ایک فرد خوشی سے نہال تھا — لہریں سی اٹھ رہی تھیں دلوں کا یہ حال تھا

آ۔د: ماشاءاللہ آپ کو خوب یاد ہے۔ آپ کا حافظہ بہت اچھا ہے۔

مہ جبیں: ابا اپنے اشعار بھول جاتے تھے مگر اماں کو یاد رہتے تھے۔ ان کی سب پرانی چیزیں، بیٹی کی مہندی، نواسی کی مہندی سب اماں کو یاد ہیں۔ باہر کی دنیا کی شاعری میں اور گھر کی شاعری کی زبان میں بہت فرق ہے۔ گھر اور بچوں سے متعلق جو نظمیں وہ کہتے تھے وہ بہت آسان زبان میں ہوتی تھیں۔ اماں جوتے والا شعر کس موقعے پر کہا تھا؟

ب۔س: ہماری طبیعت خراب تھی۔ علاج کے لیے دلّی گئے تھے۔ اتفاق سے چپل اٹھ گئے (چوری ہو گئے) ہم چپل تلاش کر رہے ہیں اور یہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہم کو سنایا:

افسوس چپل کھو گیا — کیسا مقدر سو گیا

لائی تھی خود بازار سے　　لاکھوں میں چھانٹا تھا اسے
چھ آنے دے کر آئی تھی　　بازار جا کر لائی تھی

آ۔د: کبھی آپ نے شعر کہے ہیں؟

ب۔س: شروع میں ایک افسانہ لکھا تھا۔

آ۔د: آپ کو پڑھنے کا شوق پہلے سے تھا یا شادی کے بعد پیدا ہوا؟

ب۔س: ہمارے خاندان میں سب کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ البتہ میں نے بی۔اے تب کیا ہے جب میرے بچے پڑھ چکے تھے۔

مہ جبیں: اماں کہتی ہیں کہ اگر ان کو پڑھایا گیا ہوتا تو یہ انجینیر ہوتیں۔ Fuse جوڑنے سے لے کر پنکھا ٹھیک کرنا اور flush ٹپک رہا ہے تو اس کو بھی ٹیپ سے جوڑنا یہ سب کام اماں کر لیتی تھیں۔

آ۔د: آپ نے بی۔اے میں کون کون سے سبجکٹ پڑھے ہیں؟

ب۔س: میرے پاس بی۔اے میں Philosophy، ہندی اور فارسی تھی۔

آ۔د: ہندی آپ نے Advance پڑھی؟

ب۔س: نہیں، اردو Advance پڑھی تھی۔

مہ جبیں: اماں کی ہندی بہت اچھی ہے۔ یہ ہندی کے پورے پورے ناول پڑھ لیتی ہیں۔

آ۔د: سرور صاحب ہندی زبان سے کس حد تک واقف تھے؟

ب۔س: بہت کم۔ اوستھی صاحب سرور کے Colleague تھے۔ وہ باقاعدہ ہمارے یہاں آتے تھے۔ سرور نے ان سے Script پڑھی تھی۔ ہمارے یہاں ہندی کا بھی ایک اخبار لیا جاتا تھا۔ وہ اسے پڑھ لیتے تھے۔ ہندی الفاظ بھی استعمال کرتے تھے۔

آ۔د: آپ کو پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی تو سرور صاحب آپ کی مدد کرتے تھے؟

ب۔س: ہاں۔ کرتے تھے۔ کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی تو سمجھاتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب آپ کا نام لیتے تھے یا بیگم کہتے تھے اور آپ انہیں کس نام سے پکارتی تھیں؟

ب۔س: وہ مجھے بیگم صاحبہ کہتے تھے اور میں انہیں سرور کہتی تھی۔

مہ جبیں: ابا نے آپ کو خط میں لکھ کر ایک نظم بھیجی تھی۔ کون سی تھی؟

ب۔س: جب ہم لکھنؤ میں تھے اور سرور علی گڑھ آ گئے تھے، اس وقت انہوں نے میرے اوپر ایک نظم کہی:

زندگی بے کیف سی ہے زاہدہ تیرے بغیر　　لطف جینے میں نہیں کچھ بھی رہا تیرے بغیر
سامنے ہو تو، تو یہ دنیا بہار رنگ و بو　　اور یہی دنیا ہے زندان بلا تیرے بغیر
سر جو اپنا زانوئے جاناں سے لذت یاب تھا　　اب وبال دوش ہو کر رہ گیا تیرے بغیر
لوگ کہتے ہیں کہ کیوں کھوئے ہوئے رہتے ہو تم　　کیا بتاؤں اپنی الفت کا پتہ تیرے بغیر

آ۔د: ہم نے سرور صاحب کی خودنوشت پڑھی تو اندازہ ہوا کہ وہ سیر و سفر کو بہت پسند کرتے تھے۔ آپ ان کے ساتھ کہاں کہاں گئیں؟

ب۔س: میں تو ہر جگہ ساتھ تھی جہاں جہاں وہ گئے کشمیر، مسوری، نینی تال، شملہ، بمبئی، راجندر سنگھ بیدی ان کے بہت اچھے دوست تھے۔ ہم بمبئی میں ان کے یہاں ٹھہرے تھے۔ اس کے علاوہ امریکہ، جرمنی، انگلینڈ، شکاگو، روم، اٹلی وغیرہ۔ روم میں سرور کی جیب کٹ گئی تھی۔ اٹلی میں چور بہت ہوتے ہیں۔ بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ اتفاق سے وہاں ان کا ایک شاگرد نکل آیا۔ جب ہم ٹرین میں بیٹھ رہے تھے تو اس نے کہا دیکھیے سرور صاحب یہاں چوری بہت ہوتی ہے ہوشیار رہیے گا۔ بھلا یہ کہاں ماننے والے۔ ایک جگہ اپنا بٹوا کاؤنٹر پر رکھ کے بھول آئے۔ کچھ اشرفیاں خریدی تھیں وہ بھی پرس میں تھیں۔ ہم کافی پینے نیچے اترے۔ واپسی میں کسی نے پرس چرالیا۔ اب کس سے کہیں۔ سب صاف کر دیا تھا۔

آ۔د: پھر کیا ہوا۔ بڑی مشکل ہوئی ہوگی۔

ب۔س: اتفاق سے میرے پاس کچھ پیسے تھے۔ ہم نے کہا جب آئے ہیں تو ضرور گھومیں گے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ ہمیں پیدل بھی بہت چلنا پڑا پیسے جو نہیں تھے۔ (قہقہہ).....

انہیں پہاڑوں کا بہت شوق تھا۔ کتنی چیزیں ہیں جو وہ اب بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ کشمیر وہ دوبارہ جانا چاہتے تھے۔ کہیں کا Sun-set دیکھنا چاہتے تھے تو کہیں کا Sun-rise۔ اس قسم کی خواہشات بہت زیادہ تھیں۔

آ۔د: سرور صاحب کافی دنوں تک کشمیر میں رہے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ میں کام کیا۔ کیا کشمیر جا کے وہ مطمئن تھے؟

ب۔س: کشمیر میں انہوں نے بہت کام کیا۔ وہاں علی میاں تھے۔ وامق جونپوری اسی زمانے میں واپس آ چکے تھے۔ شام کو ادیبوں اور شاعروں کا مجمع ہوتا تھا لیکن طالب علموں کو پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس سے سرور کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ہم لوگ یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے۔ اسی زمانے میں کشمیر میں پہلا بم پھٹا تھا۔ سرور کو خدا نے بچالیا۔ ان کے برابر والے کمرے میں بم پھٹا تھا۔ پوری دیوار منہدم ہوگئی تھی۔ پڑوسیوں سے ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے۔ سب کو سرور کی فکر تھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ واپس آئے۔ ان دنوں مشیر الحق، آفاق، جمال عبدالواجد، جاوید قدوس بھی وہیں تھے۔

آ۔د: سرور صاحب کس طرح کا لباس پہننا پسند کرتے تھے۔ اپنا لباس خود خریدتے تھے یا آپ خرید کر لاتی تھیں؟

ب۔س: شروع میں جب ہماری شادی ہوئی تو یہ سوٹ نہیں پہنتے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے۔ سوٹ پہننا بعد میں شروع کیا۔ ان کو خود سے کوئی خاص رنگ یا کپڑے کا خیال نہیں تھا۔ ان کے اوپر نیلا رنگ بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ سب لوگ ان کے لیے نیلی شرٹ بہت لاتے تھے۔ زیادہ تر کپڑے چھوٹا بیٹا جرمنی سے بھیجا کرتا تھا۔ ان کو خود کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب میں سفید کپڑے پہنتی تھیں تو انہیں بہت برا لگتا تھا۔ زیادہ تر شوخ رنگ کے کپڑے لاتے تھے۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے میرے لیے ساڑی ضرور لاتے تھے۔ ایک دفعہ میرے لیے ساڑیاں لائے۔ ایک ساڑی مجھ سے پوچھے بغیر رشید جہاں کو دے دی۔ میرا موڈ آف ہوگیا۔ میں نے کہا اب تمہاری لائی ہوئی چیز کبھی نہیں پہنوں گی۔

مہ جبیں: اماں کو بیگ اور جوتوں کا بہت شوق تھا۔ ابا اکثر تحفے میں لایا کرتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب کھانے میں کیا پسند کرتے تھے؟

ب۔س: انہیں کھچڑا، رساول، کریلے بہت پسند تھے اور ارہر کی دال بھی پسند تھی۔ گلا صاف رکھنے کو وہ چنے بہت کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتے تھے جسے وہ ''اوپر کی چیز'' کہتے تھے۔ وہ پائے بہت پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شہریار کو نہ جانے کیا سوجھی کہہ دیا سب سے۔ اب ہر جگہ سے پائے پک کے آ رہے ہیں۔ کوئی دعوت کر رہا

ہے، کوئی گھر بھیج رہا ہے۔ ہر جگہ پائے۔ مجھے پائے بالکل پسند نہیں تھے۔ سوال یہ ہے کہ اتنے پائے روز کون کھائے۔

آ۔د: آپ کبھی پکاتی تھیں گھر میں؟

ب۔س: نہیں۔ خانساماں پکاتا تھا۔ مجھے کچن کے کام سے الجھن ہوتی تھی۔ اب بھی ہوتی ہے۔ مجھے روٹی پکانا اب بھی نہیں آتا۔

مہ جبیں: اماں کو Potato mince بنانا آتا ہے بس۔ جب وہ لکھنو میں تھیں وہاں انہوں نے Baking کا کورس کیا تھا۔ انڈے کا حلوہ بہت عمدہ بناتی ہیں۔

آ۔د: سرور صاحب بچوں میں دلچسپی لیتے تھے؟

ب۔س: بہت زیادہ۔ بچوں کو وہ کہانیاں سناتے تھے۔ ہر سطح پر اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے۔ نظمیں یاد کرواتے تھے۔ خود بھی پڑھ کر سناتے تھے۔ ایک مرتبہ ملٹن کی Paradise Lost اپنی یادداشت سے پڑھ کے سنائی تھی اور مطلب بھی بتائے تھے۔ بچوں کے ساتھ کیرم کھیلتے تھے۔ ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ تاش میں نے انہیں سکھا دیا تھا۔ بیت بازی بہت ہوتی تھی۔

مہ جبیں: ہم لوگوں کے بچپن میں دو ٹیمیں بنتی تھیں۔ ایک ٹیم میں اماں اور دوسری ٹیم میں ابا ہوتے تھے۔ اماں کے سب شعروں کو ابا القط کر دیتے تھے کیونکہ اماں کو شعر تو بہت یاد تھے لیکن وزن کا خیال نہیں کرتی تھیں اور ابا لاحول پڑھتے ہوئے نکل جاتے تھے! ہم لوگوں کے بچپن میں گڈے گڑیا اور راجا رانی کی کہانیوں کی بجائے ابا ہمیں غالب، اقبال اور میر کے قصے سناتے تھے۔ ہم لوگوں کو سالگرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھ کر دیتے تھے۔ ابا کو لفظوں سے بڑا عشق تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ذرا سا بھی کہیں شک ہو تو فوراً ڈکشنری دیکھو۔ اس پر وہ بہت اصرار کرتے تھے۔ یہ بات اب ہم لوگ اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں۔ ہم لوگوں کو بنانے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔

رخشندہ: وہ محض ہمارے نانا نہیں ہیں بلکہ انہوں نے ہماری زندگی کا سنگ بنیاد بھی رکھا ہے۔ نہ صرف میرا بلکہ میرے بڑے بھائی اور دو چھوٹی بہنوں کا بھی۔ وہ ہماری زبان کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ جب ہم بہت چھوٹے تھے تو دلی چلے گئے تھے۔ وہاں زبان کا خیال نہیں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے کہا فلاں نے بولا۔ انہوں نے فوراً ٹوکا 'بولا' مت کہا کرو، فلاں نے کہا۔ انہوں نے ہمیں بہت سے نئے الفاظ بھی سکھائے۔ اس طرح بہت صاف ستھری اردو ہمیں ورثے میں ملی۔ W.B.YEATS کی ایک نظم کی آخری دو لائنیں بہت پڑھا کرتے تھے:

The best lack all conviction

and the best one full of passionate funny.

ب۔س: وہ بچوں کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ اپنے نواسے، نواسیوں سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ انہیں اپنے ساتھ Walk پر لے جاتے تھے۔ بچوں پر انہوں نے ایک نظم لکھی ''تین فتنے'' وہ چھپی بھی تھی۔ کچھ اس طرح تھی:

تین فتنوں کا ماجرا سنیے
قصہ دلچسپ ہے ذرا سنیے

آ۔د: وہ تین فتنے کون کون تھے؟

ب۔س: صدیق، مہ جبیں اور جاوید چھوٹا والا۔ اس کے بعد انہوں نے چار فتنے لکھے۔ یہ نواسی نواسے تھے۔

نمبر ایک بڑا ہی نیک کھائے کیک پئے ملک شیک

نمبر دو کہے رو رو مجھے بھی دو مجھے بھی دو
نمبر تین بڑی مسکین .....
نمبر چار بڑی عیار بڑی مکار ہماری یار

عرفی کے لیے انہوں نے یہ شعر کہا تھا:

یوں تو بچے اور بھی ہیں لمبے اور چوکور بھی ہیں
عرفی کی کیا بات ہے لیکن عرفی کی کیا بات

جاوید کے لیے لکھا تھا:

جاوید مقاصد میں عطا ہو تجھے رفعت
رفعت وہ ستاروں کی جہاں آنکھ جھپک جائے

آ۔د: سرور صاحب نے کبھی چاہا کہ ان کا کوئی بچہ اردو کو بطور سبجیکٹ اختیار کرے؟

ب۔س: اردو کو تو سب جانتے ہیں ہمارے یہاں۔ خود انہوں نے سکھائی اور Trained کیا لیکن ان کے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ وہ خود اردو میں ہیں تو ان کے بچے بھی اردو پڑھیں۔ کسی پر دباؤ نہیں ڈالا۔ اسی لیے بڑے بیٹے نے انگلش اور چھوٹے بیٹے نے Psychology پڑھی لیکن اردو سب کو بہت اچھی آتی ہے۔

آ۔د: سرور صاحب کے دوستوں میں گھر کون کون آتا تھا؟

ب۔س: رشید صاحب بہت آتے تھے۔ ایک لطیفہ سنو۔ ہمارا بڑا بیٹا صدیق چھوٹا سا تھا۔ سرور ایک دفعہ کہیں باہر جانے لگے تو اس نے پوچھا ابا کہاں جا رہے ہیں۔ یہ کچھ جھنجلائے ہوئے تھے کہہ دیا جہنم میں۔ رشید صاحب آئے اور صدیق سے پوچھا ابا کہاں گئے ہیں۔ اس نے کہا ''جہنم'' میں! ان کے علاوہ چغتائی صاحب (فزکس والے)، مسعود حسین خاں اور بھی بہت سے لوگ آتے تھے۔ صبح لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ احتشام صاحب جب بھی آتے تھے ہمارے یہاں ٹھہرتے تھے اور شعر سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ اختر الایمان بھی ہمارے یہاں قیام کرتے تھے اور بہت سے لوگ آتے رہتے تھے اور ہمارے یہاں ٹھہرتے تھے۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ سبھی لوگ ان کے دوست تھے۔

آ۔د: سرور صاحب کو کبھی یہ احساس ہوتا تھا کہ ان کے دوست یا ان کے شاگرد ان کا زیادہ وقت لیتے ہیں اور انہیں پڑھنے لکھنے کا موقع نہیں مل پاتا ہے۔

ب۔س: میری دانست میں تو نہیں۔ اگر کوئی آ جاتا تھا تو گھنٹوں اس سے باتوں میں مصروف رہتے تھے۔ انہیں وقت کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

آ۔د: سرور صاحب اپنے خاندان کے لوگوں سے کس طرح ملتے تھے۔ ان کی خوشی یا غم میں شریک ہوتے تھے؟

ب۔س: خاندان والوں سے وہ بڑی رواداری برتتے تھے۔ اکیلی میں کبھی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ساتھ میں ضرور رہتا تھا۔ ان کے خاندان کے لوگ مستقل میرے ساتھ رہے۔ شادی کے موقع پر ضرور شریک ہوتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب علی گڑھ میں بہت دنوں تک شعبہ اردو میں رہے، ہیڈ بھی رہے۔ وہاں کے مسائل وہ آپ سے discuss کرتے تھے۔

ب۔س: ہمیشہ کرتے تھے۔ بغیر مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ گھر میں Ph.D کے تھیسس آتے تھے یا جو کتابیں آتی تھیں وہ پہلے میں پڑھتی تھی پھر انہیں اپنی رائے دیتی تھی۔

آ۔د: وہ لوگوں کا اچھا پہلو زیادہ دیکھتے تھے یا برا؟

ب۔س: اچھا۔ مجھے غصہ بہت آتا تھا اور بہت جلدی آجاتا تھا۔ ان کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ مجھے آج تک یاد نہیں کہ سرور نے کبھی کسی کی برائی کی ہو۔

رخشندہ: وہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ اگر اس شخص کی تعریف ممکن نہ ہو تو چپ ہو جاتے تھے۔

آ۔د: سرور صاحب optimist تھے یا pessimist؟

ب۔س: بہت زبردست optimist تھے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں میں زبردست اختلاف ہو جاتا تھا۔ مثلاً ایک بار پاکستان سے عبدالحق صاحب کی جانب سے بڑا اچھا offer آیا۔ ہم نے کہا پاکستان جائیں گے۔ انہوں نے کہا:

مجھے ہر ناصح مشفق یہی تلقین کرتا ہے
کہ بزم غیر میں یوں رائیگاں رہنے سے کیا حاصل؟
گلوں کا کیا ہے وہ تو طاق نسیاں ہو ہی جائیں گے
شگوفوں کو اسیر ابتلا کرنے سے کیا حاصل

آ۔د: سرور صاحب کے پاس لوگوں کے بے شمار خط آتے ہوں گے۔ کیا وہ پابندی سے اس کا جواب دیتے تھے؟

ب۔س: ہاں۔ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ خواہ اسٹوڈنٹ ہو خواہ دوست واحباب، بچہ ہو یا کوئی unknown لیکن خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ پوسٹ کارڈ بہت لکھا جاتا تھا۔ پہلے پوسٹ کارڈ کا ہی رواج تھا۔

آ۔د: سرور صاحب کبھی ٹیلی ویژن یا فلم وغیرہ دیکھتے تھے؟

ب۔س: سرور کو کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن مجھے فلم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔

مہ جبیں: ممی بتا رہی تھیں کہ ایک بار کرنل زیدی (وائس چانسلر) کے ساتھ ممی اور کچھ لوگ ابا کو کھینچ تان کر لے گئے تھے۔ یہ دونوں وہاں بیٹھ کے یونی ورسٹی politics کی باتیں کرنے لگے۔ بیچ بیچ میں جب خیال آیا دیکھ لیا۔

آ۔د: ان کو موسیقی سے کچھ دلچسپی تھی؟ گانا سننے کا شوق تھا یا نہیں؟

ب۔س: موسیقی سے دلچسپی نہیں تھی۔ گانے نہیں سنتے تھے۔ آخر میں انہوں نے ایک ٹیپ ریکارڈر منگوا لیا تھا اور اپنے پاس رکھنے لگے تھے۔ کچھ cassettes بھی تھے اور خود کبھی کبھی گنگنایا کرتے تھے۔

آ۔د: سنا ہے ڈپارٹمنٹ میں چائے، کافی وغیرہ بنائے جانے کا رواج خود سرور صاحب نے شروع کروایا۔

ب۔س: ہاں۔ ان کے زمانے میں میاں خاں تھے۔ پرانے چپراسی۔ بدایوں کے رہنے والے تھے انہوں نے شروع کیا۔ اس سے پہلے رواج نہیں تھا۔

آ۔د: دنیا کی سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے؟

ب۔س: اخبار باقاعدہ پڑھتے تھے۔ دو اخبار انگریزی کے ہندو اور ہندوستان ٹائمز اور ایک ہندی کا اخبار لیا جاتا تھا۔ چائے کے

بعد اخبار ضرور دیکھتے تھے۔ آخر میں ایک لڑکے کو رکھے ہوئے تھے جو اخبار پڑھ کر سناتا تھا۔ ریڈیو پر خبریں بہت سنتے تھے خصوصاً B.B.C. کی خبریں۔ رات کو بغیر نیوز سنے ہوئے نہیں سوتے تھے۔ جس دن فالج کا اثر ہوا بارہ بجے تک نیوز سننے کے بعد لیٹے تھے۔ تین چار بجے ہوں گے مجھے آواز دی۔ میں پاس گئی اور پوچھا کیا بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے Stroke ہوا ہے۔ زبان پر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی بیماری سے کبھی ہراساں اور خوفزدہ نہیں ہوتے تھے۔

آ۔د: انتقال سے دو مہینے پہلے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بالکل ہشاش بشاش تھے۔ ''فکر و نظر'' سے متعلق بہت سی باتیں کیں۔

ب۔س: سرور صاحب پر مذہب کا کتنا اثر تھا؟

آ۔د: مذہبی تھے۔ ان کا خاندان مولویوں کا تھا۔ داڑھی کبھی نہیں تھی لیکن دہریہ بھی نہیں رہے۔ مذہب کو کبھی انہوں نے اپنے اوپر سوار نہیں کیا۔ مذہبی تھے لیکن کٹر نہیں تھے۔

مہ جبیں: بآواز بلند شعر تو پڑھتے تھے لیکن بآواز بلند قرآن شریف مجھے یاد نہیں میں نے سنا ہوا البتہ آخری رات تلاوت کی تھی۔ ہم لوگ یاد کرتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے۔

آ۔د: سرور صاحب بحیثیت شاعر کبھی مشاعرے وغیرہ میں جاتے تھے اور اپنا کلام پڑھتے تھے؟

ب۔س: مشاعرے میں جاتے تھے مگر اپنا کلام نہیں پڑھتے تھے۔ ایک آدھ جگہ پڑھا ہوگا۔ صدارت کرتے تھے تو پڑھتے تھے۔ سنا ہے لکھنو میں پڑھا تھا۔ لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر پر ''دلی کی آخری شمع'' Organise کیا تھا تو اس میں پڑھا تھا۔ علی گڑھ میں ۲۶ر جنوری اور ۱۵ر اگست کا مشاعرہ ہوتا تھا تو اس میں پڑھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شاید ۲۶ر جنوری اور ۱۵ر اگست کا مشاعرہ سرور صاحب نے ہی شروع کروایا تھا۔ اس سے پہلے نہیں ہوتا تھا۔

آ۔د: ایک زمانہ وہ تھا علی گڑھ کا جب سرور صاحب نے یہاں اپنے کیریر کا آغاز کیا تھا اور ایک زمانہ اب ہے علی گڑھ کا۔ وہ کچھ فرق محسوس کرتے تھے، کبھی آپ سے اس کا ذکر کرتے تھے؟

ب۔س: بہت کرتے تھے۔ کہتے تھے Values کا فرق ہو گیا ہے۔ لوگوں کے برتاؤ میں فرق آ گیا ہے۔ زبان سے لے کر رکھ رکھاؤ، ہر چیز، اخلاق سب بدل گئے۔ یہ تمام باتیں ان کو بہت ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔

آ۔د: سرور صاحب کا بہت سا کلام ابھی غیر مطبوعہ ہے اس کے بارے میں آپ نے کوئی منصوبہ بنایا ہے؟

مہ جبیں: ابا کے غیر مطبوعہ کلام کی پوری فائل تیار ہے جس کا نام ہم نے ''لفظ'' رکھا ہے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ابا کی Auto Biography کا ایک حصہ میں نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ خاص طور سے وہ حصہ جو ذرا Personal ہے۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی میں Auto-biography نمبر میں چھپا ہے۔ کچھ حصہ Annual Urdu Studies کے لیے بھیج رہی ہوں۔

﴿بشکریہ: مجلّہ ''فکر و نظر'' (سرور نمبر) نومبر ۲۰۰۳ء۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ انڈیا﴾

# مولانا ظفر علی خاں۔ کچھ یادیں

مولانا حامد علی خاں

میرے سب سے بڑے بھائی مولانا ظفر علی خاں صاحب میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی حیدر آباد دکن جا چکے تھے۔ جب میری عمر آٹھ سال کے قریب ہوئی، اس وقت وہ شاید پانچ یا چھ سال میں پہلی مرتبہ والد ماجد مولانا سراج الدین احمد خاں صاحب کی عیادت کے لیے دکن سے کرم آباد تشریف لائے۔ اس وقت ان کی عمر 35-36 برس کے لگ بھگ ہوگی۔ میانہ قد، چھریرا بدن، بارعب آنکھیں، سرخی مائل سیاہ مقطع ڈاڑھی۔ وہ سرخ ترکی ٹوپی، خوش قطع ریشمیں شیروانی، تنگ مہری کا سفید پاجامہ اور زری کا کامدار جوتا پہنے، میرے دو بڑے بھائیوں کے ساتھ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے، میرے پاس سے گزر گئے۔ اس وقت وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔

انہوں نے ہفتہ بھر تک کرم آباد میں قیام کیا اور ہم لوگ جلد ہی ان سے مانوس ہو گئے۔

ایک بات جو مجھے اپنے اس لڑکپن میں بھی عجیب لگی، یہ تھی کہ وہ عشاء کی نماز وقت ہوتے ہی پڑھ لیتے، اور بہت جلد سو جاتے، شاید اس لیے کہ صبح التزام کے ساتھ بہت ہی سویرے، منہ اندھیرے بیدار ہو جاتے تھے۔ ورزش اور پیدل سیر اور دوڑ لگانا ان کا صبح وشام کا معمول تھا۔ ایک بات جو مجھے اس وقت عجیب نہ لگی مگر اب کسی قدر عجیب لگتی ہے، یہ تھی کہ وہ ریل کا اتنا لمبا سفر طے کر کے چند دن کے لیے دکن سے پنجاب تشریف لائے تھے۔ مگر انہیں ورزش کا یہ اہتمام تھا کہ اپنی بڑے بڑے مگدروں کی زرد رنگ کی جوڑی بھی ساتھ لیتے آئے۔ چنانچہ صبح وشام باقاعدہ مگدر بھی گھماتے تھے۔ ایک شام میں نے کہہ دیا کہ اگر آپ مگدر ہلانے کے ساتھ ساتھ ٹہلتے بھی جائیں تو خوب ہو۔ ہنس کر بولے ''ہاں ٹھیک کہتے ہو'' اور پھر کرم آباد کے دفتر زمیندار کے صحن میں، جس کی زینہ دار چھوٹی چھوٹی چار دیواری پر، ہر طرف رنگا رنگ پھولوں کے گملے سجے تھے، چاق و چوبند مولانا ظفر علی خاں ٹہلنے لگے اور مگدر بھی گھومنے لگے۔

ہمارے والد ماجد مولانا سراج الدین احمد خاں صاحب نے، جو ان دنوں صاحب فراش تھے، ۱۹۰۳ء میں جریدہ ''زمیندار'' ابتداءً لاہور سے جاری کیا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد اسے اپنے گاؤں کرم آباد لے گئے جہاں اخبار کی طباعت کے لیے چار پانچ دستی مشینوں کا ایک مطبع نصب کر لیا گیا جس میں دھات کی پلیٹوں کے بجائے سفید پتھر کی بھاری سپاٹ سلیں استعمال ہوتی تھیں۔ سہولت کے لیے گاؤں ہی میں ایک چھوٹا سا سرکاری ڈاک خانہ بھی کھلوا لیا گیا۔ کرم آباد میں ان دنوں بہت چہل پہل رہتی تھی۔ جلسے بھی ہوتے تھے جن میں دوسرے شہروں کے لوگ بھی آ کر شریک ہوتے۔

مولانا ظفر علی خاں اپنے چند روزہ زمانہ قیام کرم آباد میں اعزہ واحباب سے ملتے ملاتے بھی رہے اور اخبار کے لیے مضمون بھی لکھتے رہے۔ جب وہ اپنا کوئی ایسا مضمون چھپنے سے پہلے والد ماجد کو سناتے تو وہ بہت خوش ہوتے اور ان کی حوصلہ افزائی

کے لیے فرماتے تم اتنا اچھا لکھتے ہو کہ لوگ کہیں گے اس اخبار کا تو ایڈیٹر ہی بدل گیا ہے۔

تقدیر کو یہی منظور تھا کہ والد ماجد کی یہ بات بہت جلد پوری بھی ہو جائے۔ مولانا ظفر علی خاں نے واپس حیدر آباد پہنچ کر ایک بد دماغ انگریز افسر کے متعلق، جس کا نام واکر تھا ایک نظم لکھی جو چھپ کر چند ہی دن میں حیدر آباد کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی۔ چند شعر یاد ہیں:

نہ بنگالی سے گھبرا اور نہ مدراسی کی پروا کر — مگر سجدے میں جھٹ گر پڑ نظر آ جائے گر واکر
دبک جاتے ہیں مسٹر حیدری مانند گیدڑ کے — گرجتا اور بپھرتا جب ہے مثل شیر نر واکر
پڑی پھرتی ہے ننگے سر نظام الملک کی دولت — اک اینگلو انڈین کے ہاتھ سے چادر اتر واکر

انگریز ریزیڈنٹ نے برافروختہ ہو کر اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں شہریار دکن کو توجہ دلوائی۔ مولانا ظفر علی خاں فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں یہ نظم پہنچائی گئی تو وہ اسے پڑھ کر مسکرا دیے اور فرمایا کہ ان کو پنشن دے کر واپس بھیج دو۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا دوبارہ بہت جلد پنجاب آ گئے اور لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ ابھی وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ والد ماجد کی رحلت کا وقت بہت قریب آ گیا اور انہوں نے مولانا کو بلا کر آخری وقت وصیت کی کہ ''زمیندار'' کو بند نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ مولانا والد مرحوم کی رحلت کے بعد لاہور کا قیام ترک کر کے کرم آباد تشریف لے گئے اور اخبار کی ادارت کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں نے اپنی زوردار نظم و نثر سے آریا سماجی ہندوؤں کی پُرکار سیاست کی دھجیاں بکھیرنی شروع کر دیں۔ ایک نظم کے صرف دو متفرق شعر کچھ یوں یاد پڑتے ہیں:

یہ سب ہتھکنڈے ہیں مہاراج کے — پرخچے اڑا دو سوراج کے
نہیں تو بنو گے غلاماں غلام — کسی چکرورتی مہاراج کے

ان دنوں مولانا کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ صبح ناشتا کرنے کے بعد جب دفتر جاتے، جو گھر سے ملحق تھا تو ہمیشہ سوٹ یا شیروانی پہن کر جاتے حالانکہ گاؤں میں ایسے تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ کرم آباد میں نظر بندی کے زمانے تک یہ تکلفات قائم رہے بلکہ ہم لوگ بھی یعنی میں اور حمید احمد خاں شیروانی پہنے بغیر گھر سے باہر نکل سکتے تھے۔ یہ مولانا کا ارشاد تھا کہ شیروانی پہن کر باہر نکلا کرو۔ بہت بعد کے زمانے میں مولانا ان تکلفات سے قطعاً بے نیاز ہو گئے تھے۔ کرم آباد میں اخبار کی ادارت کے ساتھ ورزش اور سیر و شکار کا مشغلہ برابر جاری رہا۔ مرغابی کے شکار کا خاص شوق تھا۔ شکار میں جب کوئی دس بارہ فٹ چوڑا ندی نالا راہ میں پڑتا تو مولانا ایک ہی زقند میں اسے پھلانگ جاتے۔ شام کو شکار کا گوشت خاص اہتمام سے پکتا اور کھایا جاتا۔ جمعدار لمپ جلتا۔ مرغابی کے گوشت میں خدا جانے اب بھی وہ مزہ ہے یا نہیں لیکن میرے دل میں اب تک مرغابی کا گوشت کھانے کی حسرت باقی ہے، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ مجھے یہ ناکافی ملا ہے۔

۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء میں علامہ اقبال، سر محمد شفیع اور سر شہاب الدین نے مولانا ظفر علی خاں کو مشورہ دیا کہ وہ کرم آباد کے بجائے لاہور میں سکونت اختیار کریں اور یہیں سے ''زمیندار'' بھی شائع ہو۔ مولانا نے اس مشورے کو خوشی سے قبول کیا اور ''زمیندار'' کو دوبارہ لاہور میں لا کر ہفتہ وار اخبار سے روزنامہ بنا دیا۔

اس زمانے میں جنگ طرابلس شروع ہو چکی تھی مولانا کو چونکہ مغربی حکومتوں کے خلاف اور خود انگریزی حکومت کے خلاف بھی مضامین لکھنے ہوتے تھے اس لیے انہوں نے آئینی مصلحت کے طور پر جارج پنجم کی وفاداری اختیار کر رکھی تھی۔ ان کا

خیال تھا کہ بادشاہ کے وفادار رہنے کے بعد حکومت پر ہر قسم کی نکتہ چینی ممکن ہے۔ جارج پنجم کے قصائد اب بھی ان کے مرتبہ دیوانوں میں موجود ہیں۔ اس عہد کے ''زمیندار'' کی پیشانی بھی مولانا نے خود وضع کی۔ اس پر ''زمیندار'' کے نام کے ایک طرف ہلال کی تصویر ہوتی اور دوسری طرف جارج پنجم کے تاج کی۔ ہلال کے نیچے علامہ اقبال کا یہ شعر چھپتا:

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

اور تاج کے نیچے نظام دکن میر محبوب علی خاں کا یہ شعر طبع ہوتا:

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

لیکن جناب قیصر ہند کی حکومت نے پہلے اخبار کی ضمانتوں اور مطبع کی ضبطیوں سے مولانا کو داد دینی شروع کی اور اس کے بعد نظر بندی، قرقی اور قید و بند کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ مولانا کی عمر کا ایک بڑا حصہ جیل ہی میں گزر گیا۔ انہوں نے اپنے ایک نومولود ننھے پوتے (منصور علی خاں) کو پہلے پہل منٹگمری جیل ہی میں دیکھا تھا اور وہ مشہور نظم لکھی تھی جس کا پہلا شعر یہ ہے:

مجھ سے ملنے کے لیے زنداں میں منصور آ گیا
ڈھونڈتی تھیں جس کو آنکھیں چشم بد دور آ گیا

اسی نظم کا ایک شعر ہے:

جانِ بابا اس سیہ خانے میں تم کیوں آ گئے
میں تو ہو کر اپنی اس عادت سے مجبور آ گیا

۱۹۱۴ء میں لفٹنٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے جب مولانا ظفر علی خاں کو کرم آباد میں نظر بند کر دیا تو چند دن بعد مولانا نے ''زمیندار'' کے کارکنوں کو حکم دیا کہ اخبار کی پیشانی پر جارج پنجم کے تاج کی صلیب حذف کر دی جائے۔ اب ان کو غصہ آیا کہ اس کی وفاداری سے کیا حاصل۔ کچھ دن اور ٹھہر کر حکم دیا کہ اب اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کا شعر بھی حذف کر دیا جائے۔ بے صلیب تاج ابھی باقی تھا۔ چند دن اور گزرے تو فرمایا کہ اب پورے تاج ہی کو اڑا دو۔ چنانچہ تاج بھی گیا۔

سر مائیکل اوڈوائر کے دل میں مولانا کا کچھ احترام بھی تھا۔ وہ مولانا کا پرانا دشمن تھا لیکن حیدر آباد کے زمانے سے ان کی قابلیت کا مداح بھی تھا۔ اس لیے انہیں سنٹرل جیل لاہور بھیجنے کے بجائے اس نے کرم آباد میں نظر بند کیا جہاں مولانا تقریباً دو میل کے علاقے میں جرنیلی سڑک پر شام سے رات گئے تک تیز تیز کئی چکر لگا لیا کرتے تھے۔ میں بھی اس تنہا سیر میں ان کے ساتھ برابر چلتا رہتا۔ بات کم ہی ہوتی تھی۔ وہ اس وقت بھی سیاہ سوٹ میں ملبوس ہوتے تھے اور مغرب اور عشاء کی نماز سڑک کے کنارے پلوں کی خشتی مینڈوں یا پشتوں ہی پر ادا ہوتی تھی۔

اوڈوایر کے بعد سر ایڈورڈ میکلیگن پنجاب کا گورنر مقرر ہوا تو یہ تحریک خلافت و ہجرت کا زمانہ تھا۔ مولانا اس زمانے میں بہت بے قرار رہتے تھے۔ بے قرار تو وہ عمر بھر رہے اور اگر میں ان کو تصور میں لاؤں تو آنکھوں کے سامنے ایک تڑپتی ہوئی بجلی لہرا جاتی ہے۔ وہ انگریزی حکومت سے ترک موالات کی تبلیغ کے لیے ملک کے طول و عرض کے دورے کیا کرتے تھے۔ میں خود صوبہ سرحد کے دورے میں ان کے ساتھ گیا تھا۔ راولپنڈی سے ہماری کار مری پہنچی۔ اس پر خلافت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ سڑک کے گرد و پیش لوگ

کھڑے تھے۔ وہاں انگریز ڈپٹی کمشنر سر پر ہیٹ رکھے خوش رنگ نیلے کوٹ میں ملبوس، سفید گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ اس نے مولانا کو دیکھ کر خوش خلقی سے ''گڈ مارننگ'' کہا۔ مولانا نے بھی سلام کا جواب دیا مگر کار چلتی رہی۔ ڈپٹی کمشنر نے آواز دی Why have you come here? کار اور آگے نکل چکی تھی۔ مولانا نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور پلٹ کر چلائے Put this question to the justice at the hands of Mr. Leoyd George! اس کے بعد گاڑی بہت آگے نکل گئی۔

مولانا قریہ بہ قریہ اور شہر بہ شہر پھرتے پھراتے، بڑے بڑے اجتماعوں سے خطاب کرتے ہوئے حضرو تک پہنچے کہ حکومت نے اس سے آگے بڑھنے پر پابندی عائد کر دی۔ آخری تقریر حضرو میں کی۔ مولانا ہر جگہ ترکوں اور خلیفۃ المسلمین کی حمایت میں پرزور تقریریں کرتے تھے، اور بڑے بڑے پیروں کے آستانوں پر پہنچ کر ان سے بھی دردمندانہ درخواستیں کرتے کہ اپنے مریدوں کو انگریزوں کی پولیس اور فوج میں ملازمت کرنے سے روکیں۔ گولڑہ (میں) ایک دفعہ رات گیارہ ساڑھے گیارہ بجے مولانا قیام گاہ سے غائب ہو گئے اور میں وہاں اکیلا رہ گیا۔ میری عمر اس وقت سولہ سترہ سال کی تھی۔ میں پیچھے دوڑا۔ وہ ایک شخص کے ساتھ پہاڑی سڑک پر تیز تیز جا رہے تھے۔ مجھے پلٹ کر دیکھا تو کہا۔ ارے تم بھی آ گئے۔ میں نے کہا جی ہاں میں بھی آ گیا۔ معلوم ہوا اس وقت بھی وہ ایک پیر کے ہاں جا رہے تھے۔ یہاں سے واپسی پر بھی عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ سڑک کے دونوں طرف گائیں بھینسیں چراتے ہوئے دہاتی لڑکے خلافت کے جھنڈے والی کار کو گزرتے دیکھتے تو دوڑ دوڑ کر سڑک کے کنارے جمع ہو جاتے اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونجنے لگتی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان پڑھ لڑکوں کے جوش و خروش کا بھی یہ عالم تھا۔

حضرو سے واپسی کے بعد جلد ہی حکومت نے مولانا پر مقدمہ چلایا اور انہیں سات سال قید کی سزا ہوئی۔

پہلے دن جب پولیس کے سپاہی سنٹرل جیل لاہور سے مولانا کو تانگے میں بٹھائے عدالت کی طرف لیے جا رہے تھے تو ہم بھی ایک تانگے میں ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ مولانا نے ہمیں مخاطب کر کے بہ آواز بلند کہا:

رحمت اللہ علی نباش الاوّل

مولانا نے دراصل اوڈوائر اور میگلیکن کا مقابلہ کیا تھا اور پہلے کفن کھسوٹ اوڈوائر پر خدا کی رحمت بھیجی تھی۔

مولانا اردو، فارسی، انگریزی اور عربی زبانوں پر بہت قدرت رکھتے تھے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ غیر معمولی طور پر وسیع تھا۔ نظم و نثر اور تحریر و تقریر کے یکساں دھنی تھے۔ اردو نظم و نثر میں ان کا شگفتہ اور باوقار طرز تحریر بالکل منفرد ہے۔ ان کی صحتِ زباں ہی کی نہیں، صحت تلفظ اور انداز خطابت کی مثال بھی بڑی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ہر قسم کی ادبی بدذوقی اور لسانی غلطی انہیں بے حد ناگوار گزرتی تھی۔

جن دنوں مرض الموت میں مبتلا تھے، عموماً ہفتوں بالکل چپ چاپ رہتے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ اب وہ بات سمجھتے بھی نہیں، لیکن اس زمانے میں بھی کسی نے ان کے سامنے حافظ کی غزل کا ایک مصرع بہ ادنیٰ تغیر یوں پڑھا:

خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود

تو مولانا برداشت نہ کر سکے اور چمک کر صحیح مصرع دہرایا:

خوش درخشید و لے دولت مستعجل بود

اب سوچتا ہوں کہ ہمارا یہ دور بھی کس عجلت سے گزر گیا!

﴿ماخوذ از نقائس ادب﴾

# آرااور تبصرے

''مخزن'' کے شمارہ (۷) کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ اس قدر اعلیٰ جریدے میں تبصرے نہ شائع ہو سکیں تو کتابوں کو صحیح حلقہ قارئین سے محروم ہونا پڑے گا۔ برادرم مشفق خواجہ صاحب ''غالب'' پر میرے مضامین کا مجموعہ شائع کر رہے ہیں۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین غیر مطبوعہ ہیں، ''سرسید احمد خاں اور جدت پسندی'' اور ''تلاش اقبال'' کے مضامین کی طرح، اگر آپ فرمائیں تو میں ''غالب'' پر ایک مضمون روانہ کروں۔ خواجہ صاحب سے معلوم کروں گا کہ اب کتاب کی اشاعت ادارہ یادگار غالب کے ذمہ ہے۔

آپ کے جریدے کے لیے عنقریب ایک مضمون روانہ کروں گا۔ یہ مضمون ''مجاز لکھنوی'' پر ہے۔ دیکھیے گا کہ آپ کے جریدہ کے مزاج کے مطابق ہے یا نہیں۔

مصحفی پر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور محمد عالم مختار حق کا مضمون ''نگارشات پروفیسر محمد اسلم'' بہت اچھا لگا۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر سلیم اختر، جگن ناتھ آزاد اور علیم صبا نویدی کے مضامین نے بھی نئے گوشے وا کیے۔ تمام پرسان حال کی خدمت میں سلام۔

پس نوشت: خط و کتابت گھر ہی کے پتہ پر کیجیے گا۔ ایک دو ہفتہ کے اندر مخزن نمبر ے پر لکھوں گا۔ تراشہ بھی روانہ کروں گا۔

**پروفیسر ڈاکٹر محمد علی صدیقی، کراچی**

==========

بڑی مسرت ہوئی کہ آپ نے مخزن پھر سے نکالنا شروع کر دیا ہے۔ آپ مجھ سے ۱۹۶۷ء سے واقف ہیں، جب آپ صحیفہ لاہور کے ایڈیٹر تھے اور میں نے صحیفہ میں لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ جناب نے میری اتنی حوصلہ افزائی فرمائی تھی کہ آج میں ساٹھ سے زیادہ کتابوں کا مصنف بن گیا ہوں۔

میرے پاس علامہ اقبال، غالب، میر تقی میر اور میر انیس وغیرہ کے تحقیقی مضامین (غیر مطبوعہ) کا انبار پڑا ہوا ہے۔ براہ کرم مطلع فرما دیں کہ آیندہ شمارہ کب تک شائع ہو سکتا ہے تا کہ میں اس کے لیے کوئی تحقیقی مضمون روانہ کر سکوں گا۔

**پروفیسر اکبر حیدری، سری نگر**

==========

مخزن (۷) ملا۔ اس کے ذریعے بہت سی پرانی ملاقاتوں کی یادیں کہنا چاہیے کہ اشتیاق ملاقات کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ کی ادبی مشغولیات ہنوز جاری ہیں۔ مخزن کے مدیران کو میرا سلام پہنچے۔ آپ نے زمانے کی طنابیں کھینچ کر بہت سے نادر مضامین یکجا کر دیے ہیں آپ کو اور آپ کے سبھی معاونین کو مبارک باد۔ مگر پھر بھی تشنگی رہی اردو رسائل کا

ادب کے فروغ میں کردار والا حصہ اور زیادہ گہرائی سے تجزیہ چاہتا تھا۔ بطور خاص قرۃ العین طاہرہ کا مضمون پسند آیا۔ میں آپ کے مضمون کو رسالے کے اوراق میں ڈھونڈتا رہا اور ناکام رہا۔ بہرحال رسالہ موصول ہوا خوشی ہوئی۔ یہ خط محض تجدید بلکہ اشتیاق ملاقات کے طور پر لکھا ہے۔ آپ کے مشاغل ان دنوں کیا ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں۔

**محمد حسن، دھلی**

==========

آپ علالت اور پیری کے باوجود جس طرح مخزن پر ان تھک محنت کر رہے ہیں، وہ نوجوانوں کے لیے بھی قابل رشک ہے۔ پھر آپ کی تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتیں بھی ماند نہیں پڑیں۔ فون کے ذریعے جس طرح آپ ادیبوں، اپنے احباب اور شاگردوں سے رابطہ رکھتے ہیں اور ادب اور ادیبوں کے بارے میں تازہ ترین معلومات سے باخبر رہتے ہیں، وہ بھی بہتوں کے لیے قابل تقلید ہیں۔ دعا ہے کہ خدا آپ کو مکمل صحت یاب کرے اور آپ کا سایہ تادیر ہم لوگوں کے سروں پر رہے۔

**ڈاکٹر انور محمود خالد، فیصل آباد**

==========

مجلہ مخزن مسلسل ملتا رہتا ہے۔ آپ کی کاوشوں سے بہت ہی قیمتی دستاویز ہے۔

**پروفیسر ڈاکٹر ڈاکٹر احمد حسین قریشی فلعداری، گجرات**

==========

معیاری مخزن پڑھنے کا شرف حاصل ہوتا رہتا ہے۔ مخزن ہی میں سر عبدالقادر کا مضمون ''اسپرانتو'' کے بارے میں پڑھ کر علامہ مضطر عباسی نے لندن سے کتابیں منگوا کر دنیا کی یہ آسان ترین زبان نہ صرف خود سیکھی بلکہ اپنے شاگردوں کو سکھلا کر تمام پاکستان میں اسپرانتو گروپس قائم کر دیے جو ہر قسم کے تعصبات سے پاک یہ زبان مفت سکھلا رہے ہیں۔ علامہ موصوف کے قرآن پاک کے اسپرانتو ترجمہ کو پڑھ کر بہت سے غیر ملکی مسلمان ہوئے ان سب کا کریڈٹ مخزن ہی کو جاتا ہے۔

شمارہ نمبر ۷ کی سب چیزیں ہی لائق مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر عفیرہ حامد نے ''اردو ادبی رسائل کا جائزہ'' (۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۰ء) کے شروع میں قابل ذکر رسالوں میں ادب لطیف کا ذکر بھی کیا لیکن تحقیقی اور تنقیدی جائزہ میں ''معیار'' ۱۹۳۶ء کے ساتھ ''ادب لطیف'' کا جائزہ پیش کرنا بھول گئیں حالانکہ آخری Lines میں سنہرے حرفوں میں لکھے جانے والے ماہ ناموں میں ''ادب لطیف'' کا نام بھی انہوں نے تحریر فرمایا ہے۔ ریکارڈ مکمل رکھنے کی خاطر مارچ ۱۹۳۵ء سے جاری شدہ ماہ نامہ ادب لطیف کا مختصراً جائزہ ہدیہ قارئین مخزن ہے۔

گزشتہ ۷۰ برس سے یہ ماہ نامہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹرز میں فکر تونسوی، فیض احمد فیض، میرزا ادیب، انتظار حسین، ذکاء الرحمٰن، کشور ناہید (اور ان کا چارکاٹولہ، مستنصر حسین تارڑ، غالب احمد، زاہد ڈار، ذوالفقار تابش) مسعود اشعر، سید قاسم محمود، اظہر جاوید، ناصر زیدی، شامل رہے۔ ۱۹۸۱ء سے صدیقہ بیگم اس کی ایڈیٹر ہیں۔

اشاعت کے شروع ہی سے سیاسی جبر کے خلاف جرأت و بے باکی کے مظاہرے کے باعث جلد ہی یہ مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ مارچ ۴۰ء میں باری علیگ کی کتاب ''کمپنی کی حکومت'' پر عطاء اللہ پالوی کا مضمون ادب لطیف میں شائع

ہوا۔ جس میں جوش ملیح آبادی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے'' کے اقتباسات بھی شامل تھے نتیجتاً ادب لطیف اور پریس سے دو ہزار روپے کی رقم بطور ضمانت طلب کر لی گئی۔

ادب لطیف کے افسانے رومانویت کے ساتھ ساتھ ترقی پسندانہ موقف بھی پیش کرتے رہے جو افسانہ نگاروں کے اندر چھپی ہوئی اس خواہش کا ادراک بھی ظاہر کرتے رہے جو برطانوی راج، نوآبادیاتی نظام سے پیدا ہونے والی سماجی گھٹن سے نجات پانے کی خواہش مند ہے اور یہی چیز افسانوں کو حقیقت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ دور غلامی میں ادب لطیف کی غزل کا لہجہ مخصوص روایتی نہیں انقلابی رہا ہے۔

اے فراق انقلاب دہر بھی کچھ وقت کی مصلحت سے دور نہیں

رجعت پسندانہ اقدامات پر احتجاج کے نتیجے میں حکومت پاکستان نے ستمبر 48 سے فروری 1949ء تک ادب لطیف پر پابندی لگا دی۔ مزاحمتی ادب اور ترقی پسند تحریک کی یہ ہمیشہ آواز رہا۔ ۱۹۸۰ء میں صدیقہ بیگم کی نگرانی میں تراجم کی ایک نئی تاریخ ادب لطیف میں مرتب ہوئی۔ اس دور میں افسانے اور نظمیں انہی ادیبوں اور شاعروں کے منتخب ہوئے جو ہمیشہ معاشرے کے سیاسی و سماجی جبر کے خلاف صف آرا رہے۔ افسانوں، شاعری، سفرناموں سے ہٹ کر کچھ ایسی تحریریں بھی ادب لطیف میں طبع ہوئیں جو کاروباری اعتبار سے اس کو نقصان پہنچا سکتی تھیں لیکن مدیرہ موصوف حاکموں کی جھوٹی خوشامد، چاپلوسی یا ظلم کی روایت کا حصہ کبھی نہ بنیں۔ مارچ ۸۱ء میں فلسطینی مصور ''برھان قرقطلی'' کی تصویروں کے عکس اور تعارف پریس ایڈوائس کے برعکس ادب لطیف میں شائع ہوئے۔ ملکی مفاد اور وقار کو ہمیشہ ادب لطیف نے مدنظر رکھا۔

**شاھد بخاری، لاھور**

==========

خوبصورت و دلکش ٹائٹل اور بہت ہی معیاری مضامین کے ساتھ قائداعظم لائبریری کا ششماہی ادبی مجلہ کا ساتواں پرچہ باصرہ نواز ہوا۔ ''اسلم کمال'' کا مضمون ''خطاطی اور مصورانہ خطاطی قدیم سے جدید روایت'' بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ احقر کا خطاطی سے بہت گہرا شغف ہے۔ اسی لیے ایسے مضامین کی یا خطاطی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تصوف میرا بہترین موضوع ہے۔ اگر مخزن کا اشاریہ مرتب کرنا چاہوں تو کیا اسے اشاعت کے لیے جگہ ملے گی یا نہیں؟ جواب کا منتظر رہوں گا۔ ''ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب'' کا مضمون ''لائبریریاں ہماری اشد ضرورت'' تو بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ دعا گو ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے ایوان بالا میں منظور ہو جائے۔ اور ہر چھوٹے بڑے شہر میں پبلک لائبریریاں قائم ہوں۔ دعا کی اپیل کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

**طیب بیداری، جھنڈیر ضلع میلسی**

==========

مواد کا چناؤ، پیشکش اور پروف پر کڑی نظر ''مخزن'' کی وہ خوبیاں ہیں جو دیگر جرائد میں کم کم نظر آتی ہیں۔ رسالے کا تحقیقی رنگ نمایاں ہے لیکن عام قاری کی دلچسپی کا بھی کچھ سامان نظر آ ہی جاتا ہے۔ زیر تبصرہ شمارے میں جن مضامین نے میری توجہ بطور خاص جذب کی ان میں ڈاکٹر سلیم اختر کا ''می رقصم'' کے زیر عنوان اپنے تخلیقی سفر کی کہانی بیان کرنا اور نئے لکھنے والوں کو اچھی

تخلیق کی جڑوں سے متعارف کرواتا ہے۔ محمد حمزہ فاروقی کا ''ازبکوں کے دیس میں'' کوئی خاص متاثر نہیں کر سکا۔ وہ باوضو گئے اور باوضو ہی واپس آ گئے۔ اگر ایسے ہی نفلی دورے کرنے ہوں تو بندہ اپنی جگہ کسی اور ''ٹیلنٹیڈ'' نوجوان کو ذاتی خرچے پر بھجوا دے تا کہ کسی کا تو بھلا ہو۔ البتہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا ''جگن ناتھ آزاد: اصل کارنامہ'' معلوماتی اور تحقیقی زاویے لیے ہوئے ہے۔ اور اقبالیات کے حوالے سے ارتقائی کڑیاں ملاتا نظر آتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا کشمیر یونیورسٹی میں ''اقبال چیئر'' کا قیام اور جنرل ضیاء الحق کے سامنے فخریہ ذکر کرنا، جواباً پاکستان میں اقبال چیئر نہ ہونے پر جنرل ضیاء کا شرمندہ ہونا اور چیئر بنانے کی ہدایات جاری کرنا۔ پاکستان میں سارے کام ہندوستان کی ضد یا ہندوستان کے برابر آنے کی کوشش میں کیے جاتے ہیں۔ جس طرح ایوب خان نے ہندوستان کے نئے شہر چندی گڑھ کی ضد میں اسلام آباد بنایا تھا۔ شمشیر حیدر شجر کا مضمون: منٹو کا افسانہ ''پھندنے'' علامات اور فن بھی اچھی پیشکش ہے اور شاید پہلی بار اس افسانے کا اتنا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ منٹو وہ خوش قسمت افسانہ نگار ہے جس کا اثر کئی نسلوں پر ہے اور وہ اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر لوگوں میں زیر بحث آتا ہے جبکہ ان کے ہم عصران سے دوگنی زندگی گزارنے کے باوجود بھی اس نام اور مقام سے کوسوں دور ہیں جو منٹو کے حصے میں آیا۔ بے شک کام ہی زندہ رہنے والی چیز ہے اور میڈیائی چکا چوند کو قبر پر لگانے والی اگربتیوں کا دھواں چاٹ جاتا ہے۔

امید ہے کہ ''مخزن'' کا یہ معیار آنے والے وقتوں میں بھی قائم و دائم رہے گا۔ میں اس خوبصورت کاوش پر ''مخزن'' کی تمام ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

**عرفان احمد خان، لاہور**

==========

My Dear Dr. Waheed Qureshi Sahib, Assalam-u-alaikum

Thank you very much for sending me the latest issue of your esteemed journal, Makhzan which I received this morning. I have always enjoyed and benefited from the varied and scholarly contributions given in each issue.

I have just finished compiling a bibliography of periodicals and newspapers published in Delhi between 1925 and 1947. It lists details of 275 titles in Urdu, 98 in Hindi, 3 in Persian, 2 in Arabic and 113 in English. .The work is based mainly on the Quarterly lists of publications registered by the Government in Delhi during this period. These lists were prepared for the official use only and in addition to full bibliographical details also contain official comments like Extremist, Moderate, Fanatical etc. Naturally, I was specially attracted to the three articles on periodical literature you have included in the present issue. I congratulate you and the contributors for higblighting the importance of this important subject. I am particularly indebted to Dr Afirah Hamid for providing very useful information in her article, Urdu Adabi rasail ka jaizah, 1936-1950.

However, some of the "details given by her about a number of titles published from Delhi

do not agree with what I have in the above mentioned bibliography.

This includes the following titles:.

Adib Monthly. June 1930 -; edited by Fasih ai-Din Ahmad, in 1943 by Farhatullah Beg, from March 1946 by M.A. Vahidi, but later in the same year by Fasih ai-Din Ahmad, followed by Pandit Kishna Gopal. 800copies printed in 1946.. Comments - Literary.

Burhan Monthly. June 1925-; edited by Said Ahmad Akbarabadi. In 1946 it was edited by A.Rahman Usmani but later again by Said Ahmad. It was published by Muhammad Idris and printed by National Press. Originally five hundred copies increasing to 800 in 1947.

Chaminstan.. Monthly. March 1941 -; editor - Agha Sarkhush Qizlbash; continued until 1947. Number of copies published in 1947: 1000.

Hamdard. Daily. Delhi, June 1925-; editor - Maulana Muhammad Ali; in March 1929 Muhammad Jafri; in June 1943 Mu'tasim Brelvi; in December 1946 M.M. Siddiqi and M.H.Askari. Printed by Comrade and Hamdard press, later in 1943 by Jayyad Press and in March 1947 by Kamal Printing Press.. At an average 1000 copies published. Government remarks- Extremist.

Ilm 0 Adab. Monthly. March 1941- edited by Saifi Nadvi. Printed by Kamal Hind Press, 250 copies.

Nada-yi Haram. Monthly. March 1942 - edited by Ziya al-Din Ahmad. Printed in Delhi Printing Works. 400 to 600 copies.

Nizam Gazette. Daily edition; March 1942 -; .edited by Gulshag Ahmad, Weekly edition from June 1943 onwards edited by Gulzarbagh Ahmad. Printed by Mahbub al-Matabi..1000 copies.

Qaum. Monthly, March 1942- edited by M.Said.. Publisher- M.Said. 500 copies. Government opinion- Extremist..

***Salim al-Din Quraishi, England***

==========

شیخ عبدالقادر کی ادارت میں گزشتہ صدی کے پہلے مہینے میں ''مخزن'' کا اجرا کیا گیا اور اس میں اقبال کی نظم ''ہمالیہ'' شائع ہوئی تو اس وقت کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ ''مخزن'' اردو کی ادبی صحافت کا ایک عہد ساز رسالہ شمار ہوگا جو وقفوں وقفوں سے بند ہو جانے کے باوجود اپنی صدائے بازگشت پوری صدی کے دوران اردو کے ایوان میں موسیقی کی لطیف دھنوں کی طرح ابھارتا رہے گا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا آزاد وطن پاکستان معرض وجود میں آیا تو ''مخزن'' عرصے سے بند تھا۔ اس نوزائیدہ ملک میں اردو کو قومی زبان کا درجہ دیا جا چکا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس نئی مملکت میں اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے روزنامہ ''نوائے وقت'' کے مدیر گرامی جناب حمید نظامی نے ''مخزن'' کی تجدید اشاعت کی اور اس کی ترتیب و تدوین کے لیے مولانا حامد علی خان کی خدمات حاصل کیں جن کا تعلق مولانا ظفر علی خاں مدیر ''زمیندار'' کے خاندان سے تھا۔ شیخ عبدالقادر اور مولانا ظفر علی

خاں کا فروغ زبان اردو کے اعتبار سے نصب العین ایک ہی تھا اور اس نصب العین کی تجدید و استحکام کے لیے مولانا حامد علی خان نے شیخ صاحب محترم کو بھی جو ''مخزن'' کے بانی مدیر تھے، نئے ''مخزن'' کے ساتھ منسلک کیا اور تاثر یہ دینے کی کوشش کی کہ مولانا عملی طور پر دور جدید کے ''مخزن'' کی سرپرستی فرما رہے تھے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شیخ صاحب نے ''مخزن'' کے ساتھ زندگی کے آخری لمحے تک تعاون کیا۔

تاہم افسوسناک بات یہ ہے کہ شیخ عبدالقادر کی وفات کے بعد ''مخزن'' زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکا۔ اس ضمن میں ''نوائے وقت'' کے انتظامی امور کے نگران شیخ حامد محمود نے مولانا حامد علی خان کو جو مکتوب لکھا اس میں ادارے کا اپنا پریس لگنے تک ''مخزن'' کی اشاعت کو معرض التوا میں ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ بعد میں روزنامہ ''نوائے وقت'' طوفانوں کی زد میں آتا اور جزر و مد سے گزرتا رہا اور اس دور کی مسلم لیگ حکومت کے عتاب کا شکار بھی ہوا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس اخبار نے ملک و قوم کی خدمات انجام دینے، اقبال کے تصورات کو سربلند کرنے اور قائداعظم محمد علی جناح کے پاکستان کی نظریاتی جہات کو مستحکم کرنے کے لیے ہمیشہ ثابت قدمی اور جرات مندی کا ثبوت دیا اور ترقی کے اتنے مدارج طے کیے کہ اب ''نوائے وقت'' ملک کا واحد نظریاتی روزنامہ شمار ہوتا ہے اور نوائے وقت کی ایک اپنی اشاعتی ایمپائر بھی ہے جس میں انگریزی اخبار دی نیشن، فیملی، پھول اور ندائے ملت شامل ہیں۔ اگرچہ اس ترقی یافتہ دور میں مخزن جاری نہ کیا جا سکا لیکن نوائے وقت نے اردو ادب کی خدمت کے لیے ہفتہ وار ادبی صفحے کا اجرا کیا جو گزشتہ نصف صدی سے تمام اصناف ادب کے علاوہ کتب اور مصنفین کے تعارف، نظریاتی مباحث، مذاکروں اور مشاعروں کا بڑے التزام سے انتظام کر رہا ہے۔ ''نوائے وقت'' کا ادبی صفحہ جو دراصل ''مخزن'' ہی کی توسیع ہے ملک بھر میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔

اس طویل پس منظری تمہید کے بعد اب یہ بتانا ضروری ہے کہ اکیسویں صدی نے اپنا سماجی، معاشرتی اور سیاسی آغاز کیا تو اس کے ساتھ ہی قائداعظم لائبریری لاہور کے ممبر بورڈ آف گورنرز جناب عنایت اللہ نے ''مخزن'' کو جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ یہ رسالہ قائداعظم لائبریری کا نمائندہ تھا تاہم اس کی ادبی جہت کو زیادہ اہمیت دی گئی اور اس کی ادارت کے فرائض بھی ملک کے نامور ادیب، ممتاز نقاد، دانشور اور محقق ڈاکٹر وحید قریشی کو تفویض کیے گئے۔ صدر مجلس خود عنایت اللہ صاحب تھے تاہم ڈاکٹر وحید قریشی کی معاونت کے لیے ایک مجلس ادارت بھی مرتب کی گئی جس میں ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین، معروف نقاد سہیل احمد خان، مشہور ڈرامہ نگار اور شاعر امجد اسلام امجد، افسانہ نگار اور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر اور اس ناچیز انور سدید کو شامل کیا گیا۔ سابق ''مخزن'' ماہنامہ تھا لیکن ''نیا مخزن'' ششماہی ادبی پرچے کے طور پر چھاپنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن مندرجات کے انتخاب کو اس قدر کڑا کر دیا گیا کہ چھ ماہ کے بعد نیا پرچہ آنے تک مخزن مسلسل پڑھا جاتا رہے اور اس کے مضامین مباحث کو جنم دیتے اور خیالات کو تازہ آکسیجن فراہم کرنے کے علاوہ قدیم روایت سے بھی وابستہ رکھیں۔

''مخزن'' کا شمارہ ہفتم جو چوتھی جلد کا پہلا شمارہ ہے۔ دامان باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کرتا ہے اور اس میں نثر کی بیشتر اصناف کی نمائندگی کرنے کے علاوہ بالعموم ایسے موضوعات کو اہمیت دی گئی ہے جن میں مختلف طبقات کی دلچسپی کے عناصر دیکھے جا سکتے ہیں۔ فکر و خیال کو متحرک کرنے کے لیے ''ادب کے فروغ میں اردو رسائل کے کردار'' پر ایک خیال انگیز مذاکرہ شامل کیا گیا ہے۔ جس میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر شبیہہ الحسن اور ڈاکٹر عفیرہ حامد نے شرکت کی ہے۔ ان میں سے اول الذکر دو اصحاب

دو معروف ادبی رسائل کے مدیر ہیں اور ڈاکٹر عفیرہ حامد ادبی رسائل کے موضوع پر ایک گراں قدر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکی ہیں۔

شخصیات و سوانح کے باب میں جگن ناتھ آزاد نے اپنے ایک معاصر گوپال متل کی شخصیت نگاری کا فریضہ بڑے خلوص اور خوش اسلوبی سے ادا کیا اور ان کی ادبی اور صحافتی زندگی کے متعدد واقعات کو اپنی عینی شہادت عطا کر دی ہے۔ مثلاً یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ گوپال متل جو ہندو تھے حمید نظامی صاحب کے دور میں ''نوائے وقت'' میں بھی کام کرتے تھے۔ حمید نظامی ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور بعض شفٹوں کے انچارج گوپال متل ہوا کرتے تھے۔ نوائے وقت میں گوپال متل کے سوا تمام اراکین مسلمان تھے جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جب شفٹ انچارج کی حیثیت میں گوپال متل نے سٹاف کے ایک رکن کے خلاف فیصلہ دیا تو حمید نظامی نے ان کے فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کی۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ شفٹ انچارج کا فیصلہ تھا۔ جو قاعدے اور ضابطے کے مطابق قائم رہنا چاہیے تھا۔ علم صبا نویدی نے انیسویں صدی کی ایک جامع الحیثیات شخصیت نواب محمد غوث خان اعظم کا شخصیت نامہ پیش کیا ہے جو مدراس میں ۳ فروری ۱۸۲۰ء کو پیدا ہوئے اور صرف بتیس سال کی عمر میں علمی، ادبی، سماجی اور تہذیبی خدمات انجام دینے کے بعد ۵/ اکتوبر ۱۸۵۵ء کو صرف ۳۵ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ مدراس کا یہ شاعر زمانی اعتبار سے ناسخ، آتش، غالب، ذوق اور مومن کا معاصر تھا لیکن اس کی شاعری کی کرنیں جنہیں اب علیم صبا نویدی نے بازیافت کیا ہے جنوبی ہند میں مدراس اور اس کے گرد و نواح تک محدود رہیں۔ تحقیقی لحاظ سے یہ مقابلہ نوادرات عالیہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ادبیات کے باب میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے امروہہ کے معروف شاعر شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے قیام دہلی کا تاریخی تذکرہ تحقیقی حوالے سے پیش کیا ہے اور یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ۴۲ برس لکھنو میں گزارنے کے باوجود مصحفی نے سب سے زیادہ اشعار دلی کی تعریف میں کہے ہیں۔ جہاں انہوں نے ۱۲ یا ۱۳ سال زندگی بسر کی۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کا مقالہ ''اردو زبان اور ہمارا رویہ'' قومی نقطہ نظر کا حامل ہے۔ ڈاکٹر قاضی عابد نے سجاد حیدر یلدرم کو اردو کا پہلا اساطیری افسانہ نگار ''خارستان و گلستان'' کے حوالے سے قرار دیا ہے۔ اس مقالے میں ''اسطور'' کی بحث بہت خیال انگیز ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ''آپ بیتی..... مقاصد و محرکات'' بیان کیے ہیں۔ اس موضوع پر اس سے قبل ڈاکٹر سید عبداللہ ایک بے حد وقیع مقالہ لکھ چکے ہیں لیکن اس مقالے میں ان کا حوالہ نظر نہیں آتا۔ آپ بیتی کی نظری تنقید کے بعد ڈاکٹر انور محمود خالد کی ''پس دیوار زنداں'' (شورش کاشمیری) ''آپ بیتی'' (مولانا عبدالماجد دریا آبادی) اور ''خدوخال'' (آغا بابر) پر مختصر تحریریں عملی تنقید کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ تینوں مختلف مزاج کے تین ادیبوں کی آپ بیتیاں ہیں جن کے دامن میں مصنف کی ذات اور ان کا زمانہ چشم دید مشاہدے کا آئینہ دار ہے۔ مخزن کا ایک اہم مقالہ خطاطی اور مصورانہ خطاطی ہے جو مصور اسلم کمال کی تحقیقی نظر اور تنقیدی زاویہ خیال کی شہادت دیتا ہے۔ اسلم کمال کے مصورانہ حافظے کی داد پروفیسر ڈاکٹر خورشید رضوی نے مقالہ ''گم شدہ اسلم کمال'' میں دی ہے۔ اور اسے ہر نئی روایت میں ایک نیا عمق دکھانے والی پراسرار کتاب شمار کیا ہے۔ اس مرتبہ ''مخزن'' میں دو اشاعتی اداروں کی کتابوں کا مجموعی تعارف کرانے کی کاوش کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک غیر تجارتی ادارہ ''شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ..... جامعہ کراچی ہے جس کی متعدد کتابوں کا تعارف رضا احمد نے کرایا ہے۔ دوسرا ادارہ مقبول اکادمی لاہور ہے جس کی کتابوں ''عمر خیام کے دیس میں'' (بلقیس ریاض) ''عجائبات فرہنگ'' (سفرنامہ یوسف خان کمبل پوش نہیں بلکہ علی سفیان آفاقی کا سفرنامہ کینیڈا) اقبال کی تین کتابوں کی شرح اور ''دلاور فگاریاں'' (انور

سدید) کا تعارف وسعت نظر سے ڈاکٹر وحید قریشی نے کرایا ہے۔ نگارشات پروفیسر محمد اسلم کے عنوان سے محمد عالم مختار حق نے ایک مرحوم علم دوست کی خدمات کی تفصیل پیش کی ہے۔ اتنے قیمتی اور معلوماتی مضامین کے ساتھ ذائقہ بدلنے کے لیے کرشن چندر کا شگفتہ مضمون ''پرہیز'' بھی پیش کیا ہے۔ لغات روزمرہ (شمس الرحمٰن فاروقی) شبری (افسانے افتخار نسیم) لمحوں کا قرض (زاہد منیر عامر) نسیم حجاز (جگن ناتھ آزاد) پر مختصر تبصرے محیط اسماعیل، عرفان احمد، شبیر قمر اور محمد ہارون عثمانی نے لکھے ہیں۔ اداریے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے فرمایا ہے کہ ''ہم ماضی پرست نہیں، ماضی شناس ہیں اور قدیم و جدید کے تسلسل کے قائل ہیں''۔ انہوں نے بجا طور پر ''مخزن'' کو کلاسیکی ادب تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے جدید تحریکات کا علمبردار بنانے کی سعی بھی کی ہے۔

**ڈاکٹر انور سدید، روزنامہ نوائے وقت ۲۶ نومبر ۲۰۰۴**

==========

Each issue of the quarterly Makhzan, edited by the veteran educationist writer, Dr. Waheed Qureshi, and published by the Quaid-e-Azam Library continues to enchant the readers with highly informative and well researched articles. In the limited space available to me I can only make mention of those which engaged my special attention.

The first is one by Dr. Quratul Ain Tahira in which she starts by posing an interesting question— how many letters are there in the Urdu alphabet? She then goes to point out the anomalies in this regard and mentions the essentials of the alphabet which are not considered in the routine count. She further goes to point the unwitting mistakes made by writers in the use of the language, and even in its pronunciations.

In another article, Dr Qazi Abid has done well to debunk the assertion of Dr Mirza Hamid Baig that the afsana (short story) in Urdu is the result of an 'import from the West'. In his article on the first topical short story written in Urdu, Qazi Abid has cleared in unequivocal terms the confusion created by some self assumed literary critics. Now about some book reviews by the editor himself. As everyone knows, Dr Waheed Qureshi is a perfectionist so far as the correct use of the Urdu language is concerned. Despite all his love and regard for me, he has more than once told me that my name should be spelt with an I and not an A, as the correct word is Ishfaque and not Ashfaque.

Unfortunately it is too late for me to make the change. Now While reviewing the books published by Maqbool Academy; Dr Waheed Qureshi has taken to task the prominent writer, Bilqees Riaz, writing about her travelogue of Iran he has

praised the contents of the book but at the same time given a long list of sentences where she has used the language incorrectly. I am sure the author would not misconstrue the remarks of the academician.

***Ashfaque Naqvi, Dawn Lahore, November 6, 2004***

==========

The journal has to be of high quality because Dr Waheed Qureshi is its editor. It is the revived Makhzan of 1901, the pioneering magazine of Sheikh Abdul Qadir which printed early Allama Iqbal and became famous as South Asia's premier literary publication. Qadir was a lawyer of repute. His next great contribution was through his son, Manzur Qadir, another great lawyer, who was made Pakistan's foreign minister by President Ayub Khan. When Sheikh Abdul Qadir was in London from 1907, Makhzan was edited by Sheikh Muhammad Ikram……. Today Dr Waheed Qureshi edits Makhzan and his reputation as an investigative man of letters is not hidden from anyone.

The volume begins with a small life sketch of Dr Saleem Akhtar in which he tells us about his one sided bent for literature and total memory lapse in respect of numbers despite the fact that he came from a family of accountants. He was in class six when his first story was published. After his family migrated to Pakistan from Ambala in 1947, he published his work in Shama in Delhi, followed by Humayun edited by Nasir Kazmi. These were literary critical essays. Thus began his career as a critic of Urdu literature. Today he stands at the head of the genre, his brief history of Urdu literature being an all time bestseller After a career in teaching, his research work is still the best in the field.

Muhammad Hamza Farooqi writes about his trip to Uzbekistan in 1993 two years after the Soviet Union broke up and the Uzbeks were overtaken by nationalism with no high regard for governance, thus confirming the myth that Muslims can't look after themselves. Mr. Farooqi's experiences with the bureaucracy in hotels and airports paints a bleak picture, but his sallies into the past in Samarqand and Bokhara remain quite uplifting. There is reference to the great scientist prince Ulugh Beg and what the mullahs did to him; there also is equal reference to the great Naqshbandi founder saint Bahauddin and to Imam Bukhari. He should have added that the tomb of Bahauddin was refurbished by our Maulana Akram Awan of the

Naqshbandi silsila with his big money and that Awan was formerly a dacoit and was involved in trying to stage a bloody military coup in Pakistan in 1995 and was prevented with great difficulty from marching on to Islamabad with his spiritual followers in 2000 in cahoots with army elements that nearly killed President Musharaf in 2003. Hamza notices the revived mosques in Uzbekistan but could hardly guess in 1993 that the Islamists would try to kill President Karimov, an early inkling of what they would try in Pakistan, and then come to South Waziristan to escape arrest and death.

Dr Rafeeuddin Hashmi is a highly respected scholar. His small piece about the Indian lovers of Allama Iqbal, Jagannath Azad, is quite an eye-opener. Azad was a good Urdu poet from Kashmir and was a devotee of Allama Iqbal, deaf to the anti-Iqbal noise from the progressive writers in India on the basis of their interpretation of the Allahabad Address in 1930. Azad ended up celebrating Iqbal every time there was an Indo-Pak war. In 1973, it was because of his efforts that Iqbal got back some of the status the nationalists and the progressives had tried to suppress. (Iqbal's poem is still one of India's national songs.) Azad established a chair of Iqbal studies in Kashmir University, a feat that Pakistan was to copy only in 1977 when Azad chided General Zia with it.

Riaz Ahmad has put together a comparative study of Nietzsche and Iqbal on the basis of the latter's references to the great German philosopher in his diaries. Iqbal was inspired by the Nietzschean *ubermensch* and found it close to his own concept of the complete man in the light of Islamic teachings. Nietzsche however was claimed by the Nazis and the *ubermensch* appeared in Euqope in the figure of Hitler himself. Hardly aware of the fascist implications of the Nietzschean superman, Iqbal saw the European nationalist challenge to colonialism in a positive light and even admired Mussolini for a time. This gave rise to the mistaken view that Iqbal's perfect man with his khudi was owed to a fascist inspiration. Iqbal was aware of the anger expressed by Western intellectuals against Nietzsche's unorthodox philosophy and compared it to the rage the Muslim orthodoxy had felt against the heterodoxy of Hallaj. Today of course our Jihadi Islam is devoted to Ibn Taymiyya.

Noon Meem Rashid's comment on the egotism of literary persons has been studied by Adeeb Suhail. Noon Meem targeted quite correctly Munir Niazi, Saqi

Farooqi and Anis Nagi and made us understand why the comment of these three about other writers is so acerbic. But then Noon Meem himself was a bit of an introvert who was not a very humane administrator at Radio Pakistan. (Josh perhaps epitomizes the type.) Aziz Ahmed said so about Noon Meem but then Quratulain Hyder and Nisar Aziz are on record as saying the same sort of thing about Aziz Ahmed. Shamsheer Haider Shajar gives us useful detail about the symbolism of tassels (Phundanay) in Manto's story of the same title. And our Dr Anwar Sadded writes a very informative study as usual about Mirza Muhammad Saeed who nursed such great persons as Patras and Imtiaz Ali Taj into literary excellence.

But the highlight of the journal lies hidden on page 117. Dr Nayyar Masood writes about a curious book left behind by Tipu Sultan: Bahr al-Munafeh. Tipu Sultan was indeed a funny man. In addition to describing disease and its prevalent cure, he writes about women. The article gives some details in Persian which could not have been safely translated. But Tipu is curious about the nine types of women he wouldn't go near and this surpasses the insulting descriptions given in a misogynist Kamasutra. Let us take a look at his nine bad women: 1) A woman who is of illrepute'2) An adolescent woman who would take to fornication and would become *fahisha* (coitus-lover); 3) A woman who is irritable and loves coitus; 4) a mad woman; 5) A woman with a hiary body; 6) A red-headed woman; 7) A black-faced woman; 8) An excessively tall woman; 9) a woman with tough hands and feet. After this, Tipu Sultan is no longer a favorite with me. But it is an excellent article!

Makhzan should give details about its writers; just giving addresses is not enough. The editor should take a literary magazine published in the West and ask his designer to reformat the journal on the lines such journals are put together these days. Makhzan looks shabby the way it is. If published more attractively. Makhzan could actually lead to the revival of literary magazines in Pakistan. Considering that it is six months in the making, its now-unspeakably drab cover can be done more competently and its content displayed better with highlighted boxes. And last but not least, pay the contributors so well that only the best write for it!

***Khaled Ahmed, Friday Times, Books etc.April 8-21, 2005***

==========

# قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی سرگرمیاں

ہارون عثمانی

۲۷ نومبر ۲۰۰۴ء

## Seminar: Indo-Pak Relations (New Prospective)

Presided by: Dr. Munir-ud-Din Chughtai Ex V.C. Punjab University, Lahore

Speakers: Dr. Muhammad Ijaz Butt A.P. Political Science Punjab University, Lahore

Dr. Sohrab Aslam Khan, Chairman Pakistan Ideological Form

Moderator: Muhammad Haroon Usmani

۲۱ دسمبر ۲۰۰۴ء

سیمینار: ''مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا صد سالہ جشن ولادت''

صدارت: ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈین وصدر شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی لاہور

مقررین: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، سابق صدر شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی لاہور

محمد تاج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری لاہور

محمد سعید، استاد شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

میزبان: محمد ہارون عثمانی

تعاون: شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

۲۷ جنوری ۲۰۰۵ء

## Lecture I:"Automating Pakistani Libraries"

(From need analysis to the selection of a suitable library system)

Speaker: Dr. Muhammad Ramzan, Chief Librarian LUMS Lahore.

Moderator: Muhammad Haroon Usmani

۱۰ فروری ۲۰۰۵ء

## Lecture II: "Automating Pakistani Libraries"

(Implementation and Maintenance of the Library System)

Speaker: Dr. Muhammad Ramzan, Chief Librarian LUMS Lahore

Moderator: Muhammad Haroon Usmani

۲۳ اپریل ۲۰۰۵ء

## "World Book and Copyright Day

Presided by: Mr. Rex Noser, Director The American Center Lahore

Chief Gust: Dr. Muhammad Ramzan, Chief Librarian LUMS Lahore

Speakers: Ms. Rebecca Mcduft US IRO, Afghanistan & Pakistan

Dr. Khalid Mehmood Malik, Lecturer Library & Information Science P.U.

Dr. Kanwal Ameen, Lecturer Library & Information Science P.U.

Moderator: Muhammad Haroon Usmani

Collaboration: The American Center Lahore

# لائبریری میں آنے والی نئی کتب

فہیم عثمانی

۱۔ سیرت رسول ﷺ/مولانا وحیدالدین خاں، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۴، قیمت -/100

۲۔ مخزن کرم/چوہدری نور احمد مقبول، لاہور: مکتبہ حضرت کرماں والا، ۲۰۰۴ء، ص ۳۰۴، مجلد، قیمت -/110

۳۔ جانے پہچانے (شخصی خاکے اور مقالے)/رضا علی عابدی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۲۵۷، مجلد، قیمت -/250

۴۔ شاخسانے (اچھوتے افسانے)/شان الحق عابدی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳ء، ص مجلد، قیمت -/175

۵۔ ترکش/جاوید اختر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۰، مجلد، قیمت -/150

۶۔ محفل/اسلام عماد، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۲۷۰، مجلد، قیمت -/250

۷۔ بانسرہ گلی سے سائبیریا تک اور ینٹ ایکسپریس (سفرنامہ)/احمد بشیر احمد، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۰، مجلد، قیمت -/450

۸۔ ھلنی منڈی تے ھنسی رن (طنز و مزاح)/احمد بشیر احمد، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۳۴۸، مجلد، قیمت -/550

۹۔ چہرے مہرے/حمیدہ اختر حسین رائے پوری، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۰، مجلد، قیمت -/200

۱۰۔ وہ کون تھی؟/حمیدہ، اختر حسین رائے پوری، کراچی، مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۹، مجلد، قیمت -/165

۱۱۔ ہمارے کاکا: سقراط بھی بے گورا اور نیشہ بھی/احمد بشیر احمد، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۲، مجلد، قیمت -/450

۱۲۔ نایاب ہیں ہم/حمیدہ اختر حسین رائے پوری، کراچی: مکتبہ دانیال ۲۰۰۳ء، ص ۲۵۵، مجلد، قیمت -/250

۱۳۔ فیض احمد فیض: شاعر اور شخص/ڈاکٹر آفتاب احمد، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۱، قیمت -/165

۱۴۔ پانی پر بچھا تخت/محمد اظہار الحق، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۰، مجلد، قیمت -/165

۱۵۔ خاکم بدہن (خاکے اور مزاحیے)/مشتاق احمد یوسفی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۴، مجلد، قیمت -/175

۱۶۔ زرگزشت (سوانح عمری)/مشتاق احمد یوسفی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۲، مجلد، قیمت -/275

۱۷۔ آب گم/مشتاق احمد یوسفی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۳ء، ص ۴۰۴، مجلد، قیمت -/300

۱۸۔ جنگی قیدی/نند کشور وکرم (مترجم)، انڈیا: نیشنل بک ٹرسٹ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۷۲، قیمت -/186

۱۹۔ اٹلس سیرت نبوی/ڈاکٹر شوقی ابو خلیل، لاہور: دارالسلام، ۲۰۰۴ء، ص ۵۱۲، مجلد، قیمت -/700

۲۰۔ خاک کے پردے (حصہ اول)/ڈاکٹر آغا سہیل، کراچی: ارتقاء مطبوعات، ۲۰۰۴ء، ص ۵۶۶، مجلد، قیمت -/250

۲۱۔ اردو ناول کے چند اہم زاویے/ڈاکٹر ممتاز احمد خان، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۲۲۴، مجلد:

قیمت-/160

۲۲۔ اردو ادب کی جستجو: منتخب تاریخ / رالف رسل، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳، ص ۴۴۲، مجلد، قیمت-/350

۲۳۔ دلی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے / شائستہ اکرام اللہ سہروردی۔ کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۵، ص ۸۸، مجلد، قیمت-/195

۲۴۔ عورت قرآن وسنت اور تاریخ کے آئینے میں / پروفیسر ڈاکٹر عابدہ علی، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۱۱۰۸، قیمت-/700

۲۵۔ منتشر مضامین / بریگیڈیر خواجہ طارق محمود، اسلام آباد: بزم علم وفن پاکستان، ۲۰۰۴، ص ۳۶۰، مجلد، قیمت-/350

۲۶۔ جنوبی ایشیا میں تہذیبی کشمکش / رانا عبدالباقی، راولپنڈی: عبدالقادر پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۲۸۷، مجلد، قیمت-/300

۲۷۔ امام حبیب ﷺ / ڈاکٹر نعیم احمد، لاہور: خاں بک کمپنی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۹۵، قیمت-/900

۲۸۔ خدوخال / آغا بابر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۴۴، مجلد، قیمت-/300

۲۹۔ ستارے میرے ہم سفر / امجد اسلام امجد، قطر: مجلس فروغ اردو ادب، ۲۰۰۴، ص ۵۷۵، مجلد، قیمت-/600

۳۰۔ دنیا کے سو عظیم کتب خانے / اقرار حسین شیخ، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۳، ص ۲۳۱، مجلد، قیمت-/300

۳۱۔ گئے دنوں کا سراغ (آپ بیتی) / نثار عزیز بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴، ص ۷۱۲، مجلد، قیمت-/900

۳۲۔ اردو کا آخری داستان گو / افتخار مجاز، لاہور: حیدر پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۴، مجلد، قیمت-/120

۳۳۔ دل بھٹکے گا / احمد بشیر، لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۳، ص ۸۹۰، مجلد، قیمت-/595

۳۴۔ اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب / افضال ریحان، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۴، ص ۳۶۰، مجلد، قیمت-/300

۳۵۔ نقائس ادب (علمی اور ادبی مضامین) / مولانا حامد علی خان، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۴ء، ص ۴۷۴، مجلد، قیمت-/300

۳۶۔ قرآن حکیم / مولانا امین احسن اصلاحی (مترجم)، لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۳ء، ص ۹۹۱، مجلد، قیمت-/550

۳۷۔ کلیات یگانہ / میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی، تدوین مشفق خواجہ، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳، ص ۹۶۰، مجلد، قیمت-/500

۳۸۔ آدمی اور کتاب (تنقیدی مضامین) / سید محمد ابوالخیر کشفی، کراچی: زین پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۴، مجلد، قیمت-/200

۳۹۔ علی سردار جعفری کے خطوط / خلیق انجم، لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۳ء، ص ۲۴۸، مجلد، قیمت-/220

۴۰۔ حیات رسول امی ﷺ / خالد مسعود، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۳، ص ۵۹۷، مجلد، قیمت 375

۴۱۔ تاریخ امریکہ / محمد فضل محمود (مترجم) لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۴، ص ۲۶۲، مجلد، قیمت 150

۴۲۔ مقالات اصلاحی (جلد دوم) / امین احسن اصلاحی، لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۴ء، ص ۴۳۰، مجلد، قیمت-/250

۴۳۔ غالب کی آپ بیتی / پروفیسر نثار احمد فاروقی، لاہور: بک ہوم، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۴، مجلد، قیمت-/100

۴۴۔ معراج نامہ سرائیکی / شوکت مغل، ملتان: جھوک پبلشرز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶، قیمت 8/50

۴۶۔ جامع علمی اردو لغت / وارث سرہندی، لاہور: علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۳، ص ۱۶۲۶، مجلد، قیمت-/480

# English Books


1. Embryo and Fetal Pathology / Enid Gilbert, Cambridge: Cambridge University press, 2004, 711p.
2. MDI and TDI: Safety, Health and the Environment/ D.C. Allport, England: John Wiley and Sons, 2003, 438p.
3. Hand book on Nondestructive testing of concrete 2nd ed../N.J. Carrino, London: CRC Press, 2004.
4. Common Breast des: A Photographic Guide to Diagnosis -----, Cambridge: Cambridge University Press, 2003, 255p.
5. Female Pelvic Reconstructive Surgery/ Stuart L. Stanton, London: Springer, 2004,383, H.B. 15301.55
6. Drug Eruption Reference Manual with CD- Rom 9th ed/ Jerome z. Litt, London: The Parthenon Publication Ltd, 2003, 542p.
7. Biomechanics of the Musculn Skeletan system 2nd ed. / Benno M. Nigg, New York, John Wiley & Sons, 2003, 643p.
8. Ear, Nose and Throat Histopathalogy 2nd ed./ Leslic Michaels, London: Springer, 2003, 551p.
9. Women's Role under Islam/ Shujaat Hussain, New Delhi: Anmol Publication, 2004, 295p.
10. Women and Development 12 Vop. Set/ Ashok Kumar, New Delhi: Anmol Publication, 2005, 380p.
11. Wars on Terrorism and Iraq/ Thomas G. Weiss, London: Routledge, 2004,247p.
12. Understanding Intelligence in the Twenty-First Century/ L.V. Scott, London: Routledge, 2004, 231 P.
13. The Venture Capital Cycle 2nd ed. / Paul Gompers, Cambridge, The MIT Press, 2004, 569p.
14. The United States, 1763-2001/ John Spiller London: Routledge, 2005, 330p.
15. The Rupture of Time/ Roderick Main, New York: Brunner-Routledge, 2004, 214p.

16. The Public Relations Handbook/ Alison Theaker, London: Routlodge, 2004, 366p

17. The Post Cold War International System/ Ewan Harrison, London: Routledge, 2004, 173p.

18. The Political Economy of Education/ Mark Gradstein, Cambridge, The MIT Press, 2005, 169p.

19. The Logic of Political Surrival/ Bruce Bueno De-Mosquite, Cambridge: The MIT Press, 2003, 536p.

20. The Justice Motive in Adolescence and Young Adulthood/ Claudia Dalbert, London: Routledge, 2004, 271p.

21. The Economics of Adjustment and Growth 2nd ed./ Pierre-Richard Agenor, Cambridge: Harvard University Press, 2004, 765p.

22. The Dimensions of Global Citizenship/ Darren J.O, Byrne, London: Frank Cass, 2003, 282p.

23. The Dialogical Self in Psychotherapy / Hubert J.M. Hermans, New York: Brunner- Rontledge, 2004, 276p.

24. The Curriculum Studies Reader 2nd ed/ Devid J. Flinders, New York: Routledge, 2004, 355p.

25. The American Ideology/ Andrew Lovine, New York: Routledge, 2004, 167p.

26. Television and Social Change Vol,1,2./ J.P. Yadav, New Delhi: Anmol Publication, 2004.

27. Telecommunications Strategy/ Peter Curwen, London: Routledge 2004, 318p

28. Social Revolution of Islam/ Muzaffar Hussain, New Delhi: Anmol Publication, 307p.

29. Social Justice in Islam/ Mohammad Shujaat, New Delhi: Anmol Publication, 327p.

30. Social Behavior in Islam/ Muzaffar Husain, New Delhi: Anmol Publication, 404p.

31. Shaping the Network Society/ Douglas Schuler, Cambridge: The MIT Press 2004, 433p.

32. Scientists Debate Gaja/ Stephen H. Schneider, Cambridge: The MIT Press,

2004, 377p.

33. Scarcity, Conflicts and Cooperation/ Pranab Bardhan, Cambridge: The MIT Press, 2005, 306p.

34. Rural Development and Village Democracy / B.K. Prasad, New Delhi: Anmol Publication, 2004,2 Vol Set.

35. Religions of the Ancient World/ Sarah Iles Johnston, Cambridge: Harvard University Press, 2004, 697p.

36. Regional Security in the Middle East/ Pinar Bilgin, London: Routledge 2005, 246p.

37. Quranic Schools: Agents of Proservation and Change/ Helen N. Boyle, New York: Coutledge 2004, 148p.

38. Questioning Identity: Gendor, Class, ethnicity/ Kath Woodword, London: Routledge, 2004, 162p.

39. Population Geography /J.P. Yadav, New Delhi: Anmol Publication 2 Vol. Set.

40. Ontological Semantics/ Sergei Nitenburg, Cambridge: The MIT Press, 2004, 420p.

41. New Qualitative Methodologies in Health and Social Care Research/ Frances Repport, London: Routledge , 2004, 185p.

42. New Globle Dangers/ Michael E. Brown, Combridge: The MIT Press, 2004, 552p.

43. National Electronic Government/ Martin Eifert, London: Routledge, 2004, 270p.

44. Moral and Political Reasoning in Environmental Practice / Andrew Light, Cambridge: The MIT Press, 2003, 357p.

45. Logic, Rhetoric, and Legal Reasoning in the Quran/ Rosalind Word Gwynne, London: Routledge, 2004, 251p.

46. Tribal Develcpment and Planning/ Arvind Kumar, New Delhi: Anmol Publication, 2004, 208p

47. Transforming Enterprise/ William H.Dutton, Cambridge: The MIT Press, 2005, 534p.

# نویں شمارے کے قلمی معاونین

۱۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، 1837/14 دستگیر سوسائٹی، ایف بی ایریا کراچی 75950

۲۔ ڈاکٹر سلیم اختر، الجودت C-569 گلی نمبر 17، جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۳۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، 28-D منصورہ، ملتان روڈ لاہور

۴۔ تحسین زہرا، مکان نمبر 2 گلی نمبر 44 کرشن نگر (اسلام پورہ) لاہور

۵۔ ڈاکٹر شاہین مفتی، پرنسپل ابن امیر ڈگری کالج جلال پور جٹاں، ضلع گجرات

۶۔ ڈاکٹر محمد کامران، استاد شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی اورینٹیل کالج، کچہری روڈ لاہور

۷۔ پرتو روھیلہ (مختار علی خاں)، مکان 8، سٹریٹ 42، F8/1، اسلام آباد

۸۔ ڈاکٹر صدیق جاوید، سی سی 556، فیز IV ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور کینٹ

۹۔ محمد حنیف شاہد، 170 جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۱۰۔ ڈاکٹر انور سدید، 172 ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۱۱۔ ریاض احمد، 216 پاک بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۱۲۔ ڈاکٹر انور محمود خالد، 24 ڈبلیو، 8 مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

۱۳۔ فرح ہارون، 161۔اے گلشن راوی لاہور

۱۴۔ اسلم کمال، 568، جہاں زیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۱۵۔ ڈاکٹر آغا سہیل، 355-A جوہر ٹاؤن لاہور

۱۶۔ ہارون عثمانی، لائبریرین / پروگرام آفیسر قائداعظم لائبریری لاہور

۱۷۔ فہیم عثمانی، شعبہ حصول کتب، قائداعظم لائبریری لاہور